ڈل کے پاسی

(افسانے)

پُشکرناتھ

مصنف کی دیگر کتابیں

۱. اندھیرے اُجالے (افسانے)

اس کتاب کو سال ۱۹۶۱ء کی بہترین تصنیف قرار دیتے ہوئے جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز نے مصنف کو مبلغ ایک ہزار روپے کے پہلے انعام سے نوازا ہے۔

۲. دشتِ تمنا (ناول)
زیرِ طبع

۳. کچے دھاگے (ناول)
زیرِ طبع

۴. غبارے (افسانے)
زیرِ طبع

اپنی ماں کے نام

ترتیب

تو نے اور تیرے فرشتوں نے سجائے افلاک

کاکلِ غم کو مگر میں نے سنوارا تنہا

قیصر

جرم اور ضمیر

۳۱ مارچ سنہ ۱۹۶۱ء کو رات کے ٹھیک بارہ بجے جب وہ اپنی کوٹھی نمبر ۵ بلڈنگ کے شمال مشرقی بیڈروم میں سو رہا تھا تو موت کے فرشتے نے اُس کے دروازے پر دستک دی۔ اتفاق سے اسی دن مُلک کا دوسرا پنجسالہ منصوبہ انجام پذیر ہوا تھا

"تمہارا نام لالہ گوسائیں داس ہے؟"

"جی مہاراج!"

اُس نے جواب دیا

"تم پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے کنٹریکٹر ہو؟"

"جی مہاراج!"

"تمہارے باپ کا نام مستری رام داس تھا؟"

"جی مہاراج"

"تو چلو میرے ساتھ آؤ!"

"کہاں؟"

"دوسری دُنیا میں یعنی یم پوری"

یہ سُن کر اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اس اندھیرے میں اُسے اپنی بیوی کا چہرہ نظر آیا۔ جو آرام سے اپنے پلنگ پر سو رہی تھی۔ یہ چہرہ جلد ہی غائب ہو گیا۔ اور اُس کی جگہ اُس کے بڑے بیٹے سے لی جو گلا سنگو انگلینڈ میں انجینئرنگ کی ٹریننگ لے رہا تھا۔

یہ چہرہ بھی اندھیرے میں تحلیل ہو گیا

اور اُس کے دوسرے بیٹے کا چہرہ نمودار ہو گیا جو علی گڑھ یونیورسٹی میں ڈاکٹر بننے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

یہ چہرہ بھی اٹ گیا

اور اُس کی اکلوتی بیٹی کا بھولا بھالا چہرہ اُبھر آیا جس کی شادی اُس نے پچھلے ہی سال سیٹھ پنچم لال کے تیسرے بیٹے بہاری لال کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے کی تھی۔ اور جس کے جہیز میں اُس نے ایک لاکھ روپے کا چیک بھی شامل کر دیا تھا!

پھر یہ چہرہ بھی ہٹ گیا

اور اُس کے بینک اکاؤنٹ سامنے آ گئے اُس نے اندھیرے ہی میں حساب لگا کر دیکھا کُل اٹھارہ لاکھ تیرے ہزار دو سو دس روپے اور چھتیس

سے نئے پیسے بنتے ہیں

اس کے بعد یہ کاغذات بھی نظر کے سامنے سے ہٹ گئے اور ایک کافی پرانی بینک پاس بُک سامنے آ گئی۔ پہلے تو وہ اُسے پہچان ہی نہ سکا لیکن غور سے دیکھنے پر پہچان گیا۔ یہ اُس کی سنہ ۱۹۵۵ء کی پاس بُک تھی جس میں کُل ایک سو بیس روپے اور دس آنے جمع تھے۔ اسے وہ بھول ہی گیا تھا۔

پھر سب چیزیں غائب ہو گئیں۔

اور ایک کالا کلوٹا بے رحم ہاتھ سامنے آ گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہاتھ پھیل گیا۔ پھر یہ ہاتھ اس کی گردن کی طرف لپکا اور اس کے حلق سے ایک گھٹی ہوئی چیخ بلند ہوئی۔

جب اُسے ہوش آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک فرشتہ اس کا ہاتھ تھامے اُسے ایک لق و دق صحرا میں لیے جا رہا ہے۔ اوپر سورج کی کرنیں اتنی تیز تھیں کہ اس کی جلد کے اندر گھسی آتی تھیں اور نیچے ریت اتنی گرم کہ پاؤں میں چھالے پڑ جاتے تھے۔ چلتے چلتے اسے ٹھوکر لگی اور وہ نیچے گر گیا۔

"دیکھ کر کیوں نہیں چلتے؟"

فرشتے نے ڈانٹ پلائی۔

"پاؤں زخمی ہو گئے ہیں مہاراج!"

"اگلا پڑاؤ کتنی دور ہو گا؟"

"سات لاکھ میل!"

"تب تو میں واقعی مر جاؤں گا۔"

"تم اس وقت بھی زندہ نہیں ہو۔"

"یہاں کوئی ٹیکسی وغیرہ نہیں مل جاتی؟ میری گاڑی تو گیرج میں ہوگی۔"

فرشتے کے ہونٹوں پر معصوم سی مسکراہٹ کھل اٹھی۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اچھا آپ پیسوں کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے۔ کوئی بات نہیں پیسے میں دیتا ہوں۔ میں اس طرح پیدل چلنے کا عادی نہیں ہوں۔"

فرشتے کے ہونٹوں پر زہر خند پھیل گیا

لالہ گوسائیں داس کو شدید غصہ آگیا۔

"عجیب آدمی ہو یار۔ میں مر رہا ہوں اور تم مسکرا رہے ہو۔"

اُس کا غصہ دیکھ کر فرشتہ قدرے سنجیدہ ہو گیا اُس نے اپنا نورانی ہاتھ پھیلا کر کہا۔

"لاؤ پیسے دے دو ٹیکسی منگواتا ہوں۔"

اُس نے جیب ٹٹولی

مگر یہ کیا؟ وہ تو بالکل ننگا تھا۔ اُس کے بدن پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ یکایک اُس کے چاروں طرف اندھیرے گھر آئے اُس نے اس اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا چاہا۔ اُس کے چاروں طرف نوٹ ہی نوٹ ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔ لیکن اُس کے ہاتھ میں ایک بھی نہ آرہا تھا۔ اُسے اور غصہ

آگیا اور اندھیرے کی چادریں اور گہری ہو گئیں اُس نے نئے ماڈل کی "ڈاج" اپنے گیرج میں دیکھی اُس کا ڈرائیور اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ اس نے ڈرائیور کو پکارا لیکن کوئی جواب نہ ملا اُس نے پھر پکارا اور اس وقت ایک زوردار قہقہے نے اُس کا منہ چڑایا۔

"میں دیکھتا ہوں تمہیں بھی اور تمہارے قہقہے کو بھی"

وہ دہاڑا اور فرشتے کی طرف لپکا

لیکن اس سے پہلے وہ فرشتے کی گردن اُس کے ہاتھ میں آتی وہ چاروں شانے چت زمین پر گر پڑا اور اُس کے حلق سے چیخ نکل کر صحرا کی لا انتہا وسعتوں میں بکھر گئی۔

○ بہت دیر کے بعد اُس نے پھر آنکھ کھولی تو کیا دیکھتا ہے کہ سامنے سونے کا ایک نورانی گنبد ہے جس پر کوئی سفید ریش بزرگ ایک موٹی سی مجلد کتاب سامنے رکھے اس کی ورق گردانی کر رہا ہے اور سامنے لوگوں کی ایک لمبی قطار کھڑی ہے فرشتے نے اُس کے کان میں کہا۔ یہی وہ پہلا پڑاؤ ہے یہاں ابتدائی جانچ پڑتال ہوگی"

"کس چیز کی جانچ پڑتال؟"

"تمہارے اعمال کی"

"لیکن میں نے کوئی گناہ یا جرم نہیں کیا ہے!"

"وہ تو کتاب ہی بتائے گی چلو لائن میں کھڑے رہو!"

وہ لائن میں کھڑا ہو گیا۔

لائن میں کھڑے کھڑے اُس نے تمام لوگوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ وہ ان میں سے بہت سے آدمیوں سے واقف تھا لیکن کسی نے اُس سے کوئی بات نہ کی۔ کھنچے کھنچے رہے۔ اُس نے سوچا نہ جانے آج کل لوگوں میں مروت کیوں نہیں رہی ہے۔ اب دیکھو! وہ جو لائن کے تیسرے نمبر پر کھڑا ہے وہ سردار جسپال سنگھ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ جب میں گورنمنٹ کالج بلڈنگ کا کام کر رہا تھا تو یہ اوورسیر تھا۔ میں نے اسے پورے ڈھائی ہزار اپنے بھائی کے بیاہ پہ دیئے تھے۔ لیکن اس وقت اُس نے دیکھ کر گردن یوں پھیر لی تھی جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔

اور وہ

۔۔۔ وہ جو سیٹھ کے بعد دسویں نمبر پہ ہے وہی کشن چند کندن لال بھاڑی ہے اگر اُس دن میں اس کی مدد نہ کرتا تو اب تک یہ دیوالیہ ہو گیا ہوتا۔ نہ جانے کہاں سے ڈیڑھ ہزار بوریاں ملاوٹ والا سیمنٹ خرید لایا تھا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ ان دنوں مجھے سرکار سے خدا جانے کا کام مل گیا تھا۔ اور مجھے سیمنٹ کی ضرورت تھی۔ بس پکڑ لیا تھا۔ دو ہفتوں کے اندر ڈیڑھ کی ڈیڑھ ہزار بوریاں نکال لایا۔ اب اگر یہی بات اسے یاد دلائی جائے تو کہے گا۔ لالہ جی! آپ نے بھی تو اُس پہ چار پانچ ہزار روپے کمائے تھے۔ نامعقول کہیں کا۔ گویا میں اس دال تو سیٹھ جی کا لیتا ڈھائی لاکھ کے ٹھیکے میں اگر پانچ ہزار بھی نہ کماتے تو لعنت تھی ایسے کام پر!

اور گوسائیں داس کو تو زیادہ غصہ اُس آدمی پہ آرہا تھا جو اُس کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ اجی حضرت! یہ وہی اُس کے ڈویژن کا اکاؤنٹنٹ ہے۔ لالہ سے ہزاروں روپے کما لئے ہیں اس کم بخت نے۔ ہر بل پہ اپنی شرح کے مطابق کمیشن بہت لیتا ہے حد ہو گئی۔ کام کوئی کرے اپنا پیسہ کوئی لگائے۔ ٹنڈر کوئی دے اسے اپنے کمیشن سے غرض ہے ابھی۔ آج ہی لیکن آج نہ جانے کونسی تاریخ ہے میرا مطلب ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۶۱ء سے ہے جی ہاں آج ہی یہ بلوں پر ایک ہزار نو سو بہتر روپے وصول کر چکا ہے کاروباری سال کا آخری دن تھا نا۔ اس دن تو ان لوگوں کا دماغ آسمان پر ہوتا ہے اس وقت دیکھو۔ میری طرف دیکھتا بھی نہیں۔ کل ہی ڈویژنل انجینیر کے پاس شکایت کروں گا۔ گوسائیں داس نے سوچا۔

ابھی وہ اپنی خیالات میں غرق تھا۔ کہ اس سفید ریش بزرگ کی آواز نورانی گنبد میں گونج اٹھی۔

"اے انسانو! اگلے پڑاؤ پر تمہارا حافظہ تم لوگوں سے چھین لیا جائے گا۔ تب تک اپنے اعمال کے بارے میں سوچو اور عبادت میں کھو جاؤ اور یہ مت سمجھو کہ اب تم زندہ نہیں ہو۔ مر گئے ہو۔ زمین پر تم لوگوں کا کفن دفن ہوئے چالیس دن گزر گئے ہیں!"

" ہرے رام! تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آج مئی کی دس تاریخ ہے"

لالہ گوسائیں داس اس خیال سے چونک پڑا

نہ جانے اُس کے بلوں کا کیا ہوا ہوگا اور اُس کا وہ بل تو اب تک

مکمل ہو جانا چاہیے تھا۔ ابھی انجنیئر صاحب سے بھی ملنا ہے اُس نے سوچا
مگر ساتھ ہی اُسے خیال آیا کہ وہ تو مر گیا ہے۔ نہیں یقین نہیں آتا تھا

"چلو، جلدی کرو!"
فرشتے نے اُسے ٹھوکا مار کے کہا

"کہاں جانا ہے؟"
اپنی بیرک میں اور کہاں! ــــــ آج گنبد کا کام ختم ہو گیا ہے
اب کل پھر لائن میں کھڑا ہونا پڑے گا۔"

یہ کہہ کر فرشتے نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ایک بیرک میں لے گیا۔ جہاں اس کونے سے اُس کونے تک لوگ سوئے پڑے تھے یہاں فرشتہ اُسے چھوڑ کر غائب ہو گیا اور لالہ گوسائیں داس اپنے نیک اعمال کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گیا۔

گنبد والے سفید ریش بزرگ نے آہستہ سے سر ہلا کر کہا
"کتاب میں لکھا ہے۔ تم نے یعنی پتھور دن لال ہلدی والا نے تمام عمر پسی ہوئی ہلدی میں جو کا آٹا ملا کر لوگوں کو ٹھگا ہے۔ تم نے زنا سپتی گھی میں رنگ ملا کے اصل گھی کے نام سے بیچا ہے۔ تم نے چاول میں سفید رنگ کے کنکر ملائے ہیں اور اسی طرح لوگوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ تم نے ــــــ"

کیا بات کرتے ہو صاحب! ذرا ثابت کر کے دکھاؤ۔ آج تک کوئی مائی کا لال ثابت نہ کر سکا!"

پٹوردن لال نے احتجاج کیا۔

یہ آج کی لائن کا پہلا آدمی تھا۔

لالہ گوسائیں داس جھلستی دھوپ میں کھڑا سب سن رہا تھا مگر وہ خوش ہو رہا تھا۔ کیوں کہ اس نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا تھا جیسے یہ لوگ۔ ایسی کمینہ حرکتیں کیوں کرتے ہیں۔

"پٹوردن لال ہلدی زالا کو جہنم کی بہترین بھٹی میں جھونک دیا جائے :"

سفید ریش بزرگ نے فیصلہ سنایا۔

"بہت کڑی سزائیں دیتا ہے کم بخت !"

گوسائیں داس نے سوچا

"دوسرا آدمی ــــ کتاب میں لکھا ہے کہ تم یعنی گھسیو رام انڈوں کا بیوپار کرتے تھے۔"

"جی ہاں سرکار !"

"کس قسم کی ملاوٹ کرتے تھے ؟"

"ہاہاہاہا ــــ کیا پوچھتے ہیں سرکار۔ انڈے میں ملاوٹ کیسے ہو سکتی ہے ؟"

یہ سن کر سفید ریش بزرگ کو ہنسی آ گئی۔

گوسائیں داس کو بھی ہنسی آگئی۔

ٹھیکیداری اور انڈوں کا کاروبار اسے ایک ہی جیسے ایماندار پیشے نظر آرہے تھے۔

" اسے دوسرے پڑاؤ پر مزید احکام کے لئے بھیجدیا جائے" سفید ریش بزرگ نے حکم سنایا۔

گوسائیں داس نے اپنے فرشتے سے پوچھا کہ دوسرے پڑاؤ پر اسے کیا کریں گے۔؟ اس نے جواب دیا کہ دوسرے پڑاؤ پر اسے جنت ایمغر کا پاسپورٹ ملے گا۔

" تیسرا آدمی ——— کتاب میں لکھا ہے، تم سے یعنی سیٹھ چنڈال چند نے لوگوں کو دواؤں کے بدلے سادہ پانی اور قیمتی انجکشنوں کے بدلے ڈسٹلڈ واٹر کے ٹیوب فروخت کئے ہیں۔ سادہ پینسلین کی بوتلوں پر قیمتی انجکشنوں کے لیبل لگا کر مہنگے داموں بلیک مارکیٹ میں بیچا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ تم نے اس طریقے پر نو مردوں، گیارہ عورتوں اور چھ بیس بچوں کو قبل از وقت موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ !"

" یہ سب جھوٹ ہے۔ بوگس! کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟" سیٹھ چنڈال چند نے گرج کر کہا۔

" ثبوت کی ضرورت دنیا کی عدالتوں میں پیش آتی ہے۔ حکم دیا جاتا ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں نکال کر اور دونوں ہاتھ کاٹ کر شجر ممنوعہ پر الٹا لٹکا دیا جائے اور نیچے آگ جلائی جائے"

حکم سنایا گیا

" بوسوائن ہیں تم کو کورٹ مارشل کر دوں گا۔ آئی ول کل یو!"

سیٹھ چنڈال چند گلا پھاڑ پھاڑ کے چیخنے لگا۔ مگر دو سیاہ قبا پوش، جو

ہوئے موت کے فرشتے اُسے لے گئے۔

لالہ گوسائیں داس نے اطمینان کی سانس لی۔ اس نے تو نہ دودھ فروش ہی ہے۔ اور نہ اُس نے کسی کو مار ڈالا ہے۔ وہ تو ایک سیدھا سادھا کنڑیکٹر ہے۔ گورنمنٹ کے کام کرتا ہے اور پیسے لیتا ہے۔

"چوتھا آدمی ـــــــــ تم یعنی سنتو کھ سنگھ نے اپنی عمر میں اکیاون آدمیوں کو مختلف موقعوں پر رشوت دی ہے۔ اور اس طرح سے خود بھی جرم کیا ہے اور انھیں بھی گناہگار بنا دیا ہے۔"

سفید ریش بزرگ نے چوتھے آدمی سے کہا۔

"گیانی جی! تسی جاندے او۔ ہن رشوت نہ دیئے تے صاحب لوکی چھتر مار کر باہر کڈ دے سنے۔"

(گیانی جی! آپ جانتے ہیں کہ آجکل رشوت نہ دیں تو صاحب لوگ جوتے مار کر باہر نکال دیتے ہیں)

چوتھے آدمی نے جواز پیش کیا۔

"ہمیں اس بات سے کوئی غرض نہیں۔ کہ رشوت دینے سے کیا ہوتا ہے۔ اور کیا نہیں ہوتا ہے۔ اس لیئے حکم ہوتا ہے کہ سنتو کھ سنگھ کے دونوں ہاتھ کاٹ کر صحرا میں چھوڑ دیا جائے۔"

یہ سُن کر لالہ گوسائیں داس کے دل کی دھڑکنیں خلط ملط ہو گئیں اُسے خیال آیا کہ اُس نے بھی اپنی زندگی میں ہزاروں روپے لوگوں کو رشوت دیئے ہیں مگر نہیں، رشوت تو کوئی دوسری چیز ہے اُس نے صرف کمیشن

دیا ہے۔ اوورسیروں کو کمیشن، اسسٹنٹ انجینئروں کو کمیشن۔ ڈویژنل انجینئروں کو کمیشن۔ ٹنڈر پاس کرنے والوں کو کمیشن۔ اکاؤنٹنٹوں کو کمیشن اور جہاں کمیشن نہیں دیا تھا وہاں چائے دی تھی۔ دعوت کھلائی تھی۔ شراب پلائی تھی، مٹھائی اور بخشش دی تھی۔ یہ چیزیں تو رشوت ہرگز نہیں ہوسکتیں

وہ ابھی ان ہی سوچوں میں غرق تھا۔ کہ اُس کے فرشتے نے اُسے ٹھوکا مارا۔

"چلو بیرک میں سو جاؤ تمہاری باری کل آئے گی۔"

بیرک میں داخل ہوکر لالہ گوسائیں داس کے دماغ کی بے کلی بدستور قائم رہی اُسے رہ رہ کر سفید ریش بزرگ پر غصہ آرہا تھا۔ آخر یہ کیا بات ہوئی کہ کسی آدمی کو رشوت دو اور اس پر سزا بھی خود ہی بھگتو۔ مگر وہ خواہ مخواہ ڈر رہا تھا۔ اُس نے رشوت نہیں دی تھی، یہ سوچتے سوچتے اُسے چند باتوں کا خیال آیا چند معمولی باتوں کا۔ اُسے خیال آیا کہ ایک مرتبہ جب وہ جہلم نالے کا پل بنوا رہا تھا تو ایک مزدور کام کرتے کرتے مٹی کے تودے کے نیچے آکر جان بحق ہوگیا تھا۔ قاعدے کے مطابق اُسے اُس کے لواحقین کو تین سو روپے ہرجانہ دینا تھا۔ لیکن اُس نے ہیرپھیر سے کام لے کر اُنہیں کچھ بھی نہ دیا تھا۔ لیکن یہ تو معمولی باتیں تھیں، کتاب میں ایسی باتوں کا ذکر کہاں ہوگا۔

اُسے یہ بھی خیال آیا کہ گورنمنٹ ہسپتال کی نئی بلڈنگ بنانے میں

اُس نے بیدار کی لکڑی استعمال کرنے کی بجائے گھٹیا کیل کی لکڑی ہی استعمال کی تھی اور اِس بات کو چھپانے کے لیے ایک انجینئر کو نہ ہزار روپے دئے تھے مگر یہ تو کاروباری رموز ہیں۔ بھلا کتاب میں اِس واقعہ کا ذکر کیوں آنے لگا اُسے یہ بھی خیال آیا کہ اُس نے متعلقہ اسٹاف کو اپنا کمیشن دے کر "راہ خدا" ڈیم میں ناقص مصالحہ استعمال کیا تھا جس کی وجہ سے وہ مکمل ہونے کے سال بھر بعد ہی کریک ہو گیا تھا۔ مگر یہ بھی کاروبار کی باریکیاں ہیں۔ کتاب میں ان باتوں کا کیا کام۔ کتاب میں وہی باتیں ہوں گی جو ذرا سنجیدہ قسم کی ہوں مثلاً دواؤں میں ملاوٹ، کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ، لوگوں کی جانیں لینا یا رشوت دینا وغیرہ وغیرہ توبہ توبہ ایسے لوگ واقعی گناہگار ہیں انہیں کڑی سے کڑی سزائیں ملنی چاہئیں۔ لالہ گوسائیں داس تو ہمیشہ خوف خدا سے ڈرتا رہا ہے۔ وہ ہمیشہ بھگوت بھجن کرتا رہا ہے۔ صبح مندر بھی جایا کرتا تھا۔ اور یہ بات تو وہ بھول ہی گیا تھا کہ ودھوا آشرم کی نئی بلڈنگ کا ٹھیکہ بھی اُسی نے لیا تھا محض اپنے مندر جانے کی عادت کے طفیل اور نہایت ایمانداری سے اِس کام کو پایہ تکمیل کو پہنچایا تھا۔ یعنی بیالیس ہزار کے کام میں صرف نو ہزار کمائے تھے . . . .

سوچتے سوچتے لالہ گوسائیں داس کو ایک اور بات یاد آگئی۔ نہ جانے آج اُسے باتیں کیوں یاد آ رہی تھیں۔ اُس کا حافظہ تو کبھی تیز نہ تھا ممکن ہے اب ہو گیا ہو۔ اُسے یاد آیا کہ زنانہ کالج کی عمارت میں اس نے سیمنٹ کے کام میں ۷۵ فیصدی سیمنٹ، ۱۵ فیصدی چونا اور ۱۰ فیصدی ریت کی بجائے

۳۰ فیصدی سیمنٹ ۵۰ فیصدی ریت اور ۵ فیصدی چونا لگایا تھا۔ اور جب انجنیئر متعلقہ نے یہ بات جانچ لی تھی۔ تو اُس کا منہ بند کرنے کے لیئے اُسے تین ہزار روپیہ دیا تھا۔

اگر خدا نہ خواستہ کتاب میں یہ رقم غلطی سے رشوت کے کالم میں لکھی گئی ہو تب؟ ــــ مگر نہیں وہ کہہ سکتا ہے کہ یہ کاروباری رموز ہیں۔ یہ رشوت ہرگز نہیں ہے۔ لیکن یہ سفید ریش بڈھا تو ایک نہیں مانتا عجیب آدمی ہے۔ یہ عجیب کتاب لکھی ہے کم بخت نے! کیا بھروسا ہے اس کتاب کا سوچتے سوچتے لالہ گوسائیں داس کو خیال آیا کہ اگر یہ کتاب غائب کر دی جائے تو؟ ہاں بہت اچھا خیال ہے۔ اس کتاب کو غائب ہونا ہی پڑے گا۔ اُس نے سوچا کہ میں اس کتاب کو چرالاؤں گا تاکہ لوگ کڑی سزاؤں سے بچ جائیں۔ ویسے میرا اپنا ریکارڈ تو بالکل صاف ہوگا۔ ہونا ہی چاہئے یہ خیال آتے ہی اُس نے بیرک میں اِس کونے سے اُس کونے تک نظر دوڑائی سب آدمی سو گئے تھے۔ سب فرشتے اور فرشتہ موت بھی نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ وہ اُٹھا اور تمام پاؤں پر ایک بار پھر غور کرکے اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا بیرک سے باہر آگیا۔

باہر آکر لالہ گوسائیں داس کو خیال آیا کہ ممکن ہے گنبد میں کوئی فرشتہ اُس کتاب کی رکھوالی کر رہا ہو۔ مگر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟ اگر کوئی دیکھ لے تو کہوں گا ذرا پیشاب کرنے باہر آگیا تھا۔

وہ دبے پاؤں گنبد کی طرف بڑھا۔ گنبد میں کوئی فرشتہ نہ تھا۔ کتاب

گنبد کے بیچوں بیچ سرخ پتھر کے بنے ہوئے میز پر پڑی تھی اُس نے کوئی آواز پیدا کیے بغیر گنبد کی سیڑھیاں طے کیں۔ اب میز پر رکھی ہوئی کتاب اُس کے بالکل سامنے تھی اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ میز کی طرف بڑھا۔ اور ایک ہی جھپٹے میں کتاب اٹھا لایا۔ کتاب بغل میں دبا کر وہ تیز تیز چلتا ہوا گنبد کی پچھلی سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔ اور ایک جھاڑی میں چھپ کر سوچنے لگا اب اس کتاب کا کیا کیا جائے۔ اُس کا دل پھر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اگر کہیں فرشتے نے دیکھ لیا تو؟ مگر یہاں تو کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے ایک بار کتاب کھول کے دیکھنا چاہی۔ کتاب کا کاغذ گہرے نیلے رنگ کا تھا۔ اور اس پر سفید روشنائی سے عبارت لکھی ہوئی تھی۔ نیلا رنگ اور سفید روشنائی یہ میں پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔ اُسے خیال آیا لیکن؟ اس کتاب کو میں کہاں چھپاؤں؟ یہاں سے بھاگنا تو ناممکن ہے۔ وہ شدت سے سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے اُسے خیال آیا کیوں نہ اس کتاب کو جلا دیا جائے۔ تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ لیکن کیسے جلایا جائے؟ ماچس تو اس کے پاس ہے نہیں اور آگ بھی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ پھر کیا کیا جائے؟ اتنا وقت نکلا جا رہا ہے۔ یکایک اُسے خیال آیا اور وہ اچھل پڑا۔ اوہو میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ کیوں نہ میں اس کتاب کو کھا جاؤں۔ ٹھیک ہے میں اسے کھا جاؤں گا۔ وقت تو لگے گا لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ اور وہ کتاب کا ایک ایک ورق پھاڑ کر کھانے لگا چباتے چباتے اُس کے جبڑے دکھنے لگے۔ اور وہ سوچنے لگا کاش وہ ایک گدھا ہوتا

تاکہ کتاب چبانے میں سہولت رہتی۔

بصرہ بلڈنگ کے شمال مشرقی بیڈروم میں لگے ہوئے کلاک نے نو بجائے۔ بیڈروم کی کھڑکیوں سے سورج کی کرنیں کمرے میں داخل ہو کر کمرے کی دلکشی اور ڈیزائن میں چار چاند لگا رہی تھیں۔ اتنے میں مسز گوسائیں داس نے بیڈروم کا دروازہ کھولا۔ اور اندر داخل ہو گئیں۔

اندر داخل ہوتے ہی اُس کے حلق سے ایک بلند چیخ نکلی اور بصرہ بلڈنگ کے گوشے گوشے میں گونج اٹھی۔

سامنے لالہ گوسائیں داس کنڑ بکرہ خوب صورت قالین پر بے ہوش پڑا تھا۔ اُس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اور "راہ خدا ڈیم" کے بلیو پرنٹ ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ جن میں سے کچھ اُس نے چبا چبا کر پھینک دیئے تھے کچھ اُس کے منہ میں تھے اور کچھ ہاتھ میں!

بابِر لک کے تیسرے پنج سالہ منصوبے کا آغاز ہو گیا تھا۔ ●●

صُبح کا بھولا

نہ جانے کب آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹا تھا اور روشنی کی ایک لکیر سی بناتا میرے دل کے نرم گرم گوشوں میں چھپ گیا تھا میرے ذہن میں ایسی کوئی بھی تصویر نہیں جس کی نوک پلک میں نے سنواری ہو اور جسے بڑے اہتمام کے ساتھ میں نے اپنے دل کے منقش طاق پر کسی سنہرے فریم میں سجایا ہو۔ اب اگر ستارا گھوش یہ کہتی ہے کہ وہ تین سال سے مسلسل محبت کرتی آئی ہے تو میں بوکھلا نہ جاؤں تو کیا کروں ؟

ستارا گھوش بالکل جھوٹ کہتی ہے میں اس کی بات کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا مگر ٹھہریئے میں آپ کو ساری بات ہی کیوں نہ بتا دوں۔

میں جیون داس مراری داس کمپنی ہول سیل ڈرگسٹس اینڈ کیمسٹ نامی فرم میں کام کرتا تھا۔ کام کیا کرتا تھا پارٹ ٹائم کام کرتا تھا۔ یعنی شام کو دو گھنٹے اُن کی فرم میں پیہ بخش کرتا اور مہینے کی پہلی تاریخ کو پانچ سو روپے کا چیک وصول

کرتا تھا۔ اس کے علاوہ میرا اِس فرم کے ساتھ کوئی سروکار نہ تھا۔ بالکل کوئی سروکار نہ تھا۔ اور یہ بات اس لئے دوہرانا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ پچھلے دنوں جو اخباروں میں خبریں آئی تھیں۔ کہ جیون داس مرن داس کمپنی نقلی دوائیاں فروخت کرتی ہے۔ اور ہندوستانی امپولز پر ولایتی لیبل لگا کر منہ مانگے داموں پر فروخت کرتی ہے اُن کی روشنی میں، آپ مجھے غلط نہ سمجھ بیٹھیں۔ میرا کام تو مریض کو دیکھ کر نسخہ لکھ دینا تھا۔ سارا گھوش کا کام ان نسخوں کو رجسٹر میں درج کرنا تھا۔ اور دوائیں دینے کا کام کمپنی کا ایک پارٹنر مسٹر مرن داس خود کیا کرتا تھا

یہ میری عادت ہے کہ بات کو پہلے ہی واضح کر دیتا ہوں یہ نہیں کہ سارا گھوش کی طرح کسی اشارے سے کام نہ لوں کوئی وضاحت ضروری نہ سمجھوں اور تین سال کے بعد یعنی غور کرنے والی بات ہے پورے تین سال کے بعد یہ کہوں کہ میں آپ سے مسلسل محبت کرتی آئی ہوں

بالکل جھوٹ بولتی ہے یہ لڑکی!

سوچنے کی بات ہے۔

یعنی میں بالکل انکار بھی نہیں کرتا کہ میں سارا گھوش کو پچھلے تین سال سے نہیں جانتا۔ جس دن میں پہلی بار جیون داس مرن داس کمپنی میں کام کرنے کی غرض سے گیا تھا۔ تو سب سے پہلے سارا گھوش کی مسکراہٹ ہی نے میرا خیر مقدم کیا تھا میں نے پہلی ہی نظر میں دیکھا کہ سارا گھوش ایک خوبصورت لڑکی ہے۔ اس کے باوجود کہ اُس کے لمبے لمبے بال کمر تک لہراتے چلے گئے ہیں اور اس کے نازک ہونٹوں پر کوئی لپ اسٹک کی تہہ نہیں جمی ہوئی۔ اور اس کے باوجود کہ اُس کی آنکھیں بڑی روشن اور گہری ہیں۔ اور اُس کے [illegible]

ہیں ایک توازن ہے یعنی ان تمام باتوں کے باوجود سارا گھوش مجھے خوبصورت نظر آئی تھی حالانکہ آج کل خوبصورتی کے معیار یکسر بدل گئے ہیں آج کل ایبسٹریکٹ آرٹ کا زمانہ ہے اور ایسی لڑکی کو خوبصورت سمجھا جاتا ہے کہ جس کے بال ہالشرم بھر لمبے ہوں۔ جس کے ہونٹ گہرے رنگ کی لپ اسٹک سے ٹیڑھے میڑھے بن گئے ہوں۔ جن کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے تیر رہے ہوں جس نے ایسے کپڑے پہن لئے ہوں جن سے جسم میں ایک غیر متوازن کیفیت پیدا ہو گئی ہو اور جس کے دانت مسلسل سگرٹ نوشی اور مسلسل چیونگ گم چبانے سے بے رونق بن گئے ہوں اور مسوڑوں سے اکھڑے ہوئے نظر آ رہے ہوں۔

سارا گھوش ان تمام نزاکتوں اور لطافتوں سے محروم تھی پھر بھی وہ مجھے خوبصورت نظر آئی تھی۔ دراصل اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے اُس خون کا ہے جو میری سیدھی سادی ماں کی شریانوں سے مجھ میں سرایت کر گیا ہے۔ ورنہ میں نے چار سال ولایت اور ایک ماہ اسٹیٹس میں رہ کر خوب اپنے آپ کو ریفارم کیا ہے۔

سارا گھوش کا کہنا ہے کہ اُسے پہلے ہی دن مجھ سے محبت ہو گئی تھی یہ بات بھی غلط ہے کیوں کہ جب میں پہلی بار اپنی میز پر بیٹھ کر مریضوں کو دیکھنے لگا۔ تو میں نے دیکھا کہ وہ برابر مجھے گھور رہی ہے۔ بالکل ایسے جیسے ایک شرمیلا بچہ کوک سے چلنے والے کسی جاپانی کھلونے کو دیکھ رہا ہو اور کھلونے کو دیکھ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک رنگ آتا ہو اور ایک

جاتا ہو۔ اُس کے ہونٹوں کے کونے رُک رُک کر تھر تھراتے ہوں۔ عجیب! اب سب مریضوں کو دیکھ کر جانے لگا تو میں نے مسٹر جیون داس کے ساتھ ہاتھ ملا کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر خالص انڈین طریقے سے نمستے کہی۔

"ویل مِس ــــ؟"

"گھوش ــــ سارا گھوش ــــ!"

اُس نے شرما شرما کر دھیرے سے کہا

"اچھا مِس گھوش کل تک کے لیے اجازت ــــ"

میں نے کہا اور دوکان سے باہر آگیا۔ اب آپ ہی بتایئے کہ اتنی سی بات میں مجبوری کہاں سے آگئی؟ دراصل میں اُسی دن سمجھ گیا تھا کہ سارا گھوش مجھے ناحق خوبصورت لگتی ہے۔ کیوں کہ کسی لڑکی کا اتنا شرمانا اس کی بدصورتی کی دلیل ہے۔ یعنی بالکل نہیں شرمائی تھی جب میں پہلی بار اُسے لندن کے ادیب امیر سے ملایا تھا کہ جس نے صرف آدھ گھنٹہ کی ملاقات کے بعد ہی مجھے اسپیس آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔ ان ولایتی لڑکیوں کی بات ہی اور ہے جب ہی اپنے انڈیا کے تقریباً سارے امیر لڑکے ولایتی یا امریکن لڑکیوں سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اور تقریباً ہماری دولت مند لڑکیاں کسی ہیرو یا ہیم کسی ڈونر یا ڈالر کے خواب دیکھتی ہیں۔ خیر اس بات کو جانے دیجیے بات سارا گھوش کی ہو رہی ہے۔

مجھے پریکٹس کرتے ہوئے کئی مہینے گزر گئے اور اس دوران میں میری اندر سارا گھوش کی بات چیت چند رسمی جملوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ آخر ایک دن جب میرے سامنے کوئی مریض نہ تھا اور ابھی آدھ گھنٹہ مجھے اور بیٹھنا تھا اور مسٹر مرلی داس دکان کے بہت اندر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا تو میں نے خاموشی سے اکتا کر سارا گھوش کے ساتھ بات چیت کا سلسلہ شروع کیا۔

"مس گھوش کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا

"کچھ بھی نہیں مسٹر گوتم بس بیٹھی ہوں"

"تمہارا کوئی بوائے فرینڈ نہیں؟" میں نے پوچھا

"جی نہیں۔ یہ ڈراما کم ہی یہ سلسلہ ہندوستان میں چلتا ہے۔"

"ڈیری میڈم! اچھا یہ بتاؤ تمہارا کوئی ڈیٹ تو نہیں آج؟"

"ڈاکٹر! آپ اپنی شرم شاید ولایت میں بھول آئے ہیں:" اس نے غصے سے کہا۔

"کیوں کیا ہو گیا۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے؟"

میں نے حیران ہو کر پوچھا

لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا صرف برہم نگاہوں سے مجھے چند لمحوں تک دیکھتی رہی اور اس کے بعد اٹھ کر دکان کے اندرونی حصے میں چلی گئی۔ میں نے سوچا یہ لڑکی ضرور پاگل ہے آخر میں نے ایسی کون سی

بات کچھ تھی جس سے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ رات کو جب
کلب گیا تو میں یہی سوچ رہا تھا۔ میں نے اس بات کا ذکر مس ایچ ملہوترا سے کیا

”گوتم تم کو کیا ہو گیا ہے تم کیوں ایسی لڑکیوں کے ساتھ بحث کرتے ہو!
ہندوستانی لڑکیاں ان باتوں کا برا مانتی ہیں۔“

”مجھے کیا معلوم تم بھی تو ہندوستانی لڑکی ہو۔ تم برا کیوں نہیں مانتیں؟“

میں نے معصومیت سے پوچھا

”میری بات اور ہے سٹوپڈ! میری سطح پر پہنچتے پہنچتے ان لڑکیوں
کو دس سال لگیں گے۔ وہ بھی اگر سپیڈ حسبِ خاطر خواہ رہی تو“

مس ایچ نے کہا۔

اور یہ بات مجھے ٹھیک ہی نظر آئی۔ دوسرے دن میں نے سارا گھوش
سے معافی مانگ لی اور پھر کبھی اس کے ساتھ ایسی باتیں نہیں کیں۔ مگر سوال پیدا
ہوتا ہے کہ سارا گھوش کو مجھ سے محبت کیسے ہو گئی۔ اس کا کہنا ہے کہ میں وہ
پہلا نوجوان تھا جس میں اسے کچھ دلچسپی نظر آئی تھی۔ اور یہی دلچسپی جب
شاید یہ صورت اختیار کر گئی۔ تو محبت بن گئی۔ لیکن میں نے محبت کرنے کے جو
ڈھنگ سیکھے ہیں یہ بات اس سے کتنی مختلف ہے ہائے اپنے انڈیا کی
لڑکیوں کو تو محبت کرنا بھی نہیں آتا۔

غور کیجیے کہ جب میں چند دنوں کے لیے بیمار ہو گیا تو اور لوگوں کے
علاوہ سارا گھوش بھی مجھے دیکھنے کے لیے آ گئی تھی۔ اور اس کے بجائے کہ
گھڑی دو گھڑی کے لیے میرا دل بہلاتی اس نے مجھے اور بیمار کر دیا۔ اس کے

ہاتھوں میں کوئی گلدستہ نہ تھا۔ اور نہ میرے لئے کچھ دلچسپ انگریزی رسالے ہی لائی تھی۔ خالی ہاتھوں ہی آگئی اور میرے بیڈ کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی مسٹر گوتم ؟"

"بس بیمار ہوں سارا !"

میں نے بستر پر پڑے پڑے ہی جواب دیا۔

اور فوراً ہی مجھے محسوس ہوا کہ میری زبان سے اپنا نام سُن کر وہ سٹپٹا گئی۔ اتنا ہی نہیں اُس نے میرے ماتھے پر یوڈی کلون بھی نہیں لگایا اور نہ کچھ لطیفے سُنا کر میرا دل ہی بہلایا۔ بلکہ ایسے مُنہ پھُلائے بیٹھی رہی جیسے بیمار میں نہیں وہ خود ہو۔ دستور تو یہ ہے کہ بیمار کے ساتھ کچھ میٹھی میٹھی باتیں کر کے اُس کا دل بہلاؤ۔ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کچھ رو مانس کی فضا قائم کرو تاکہ بیمار کا دل بہل جائے۔ لیکن سارا گھوش بس میرے سامنے بیٹھی رہی اور اپنی انگلی کے گرد اپنی ساری کا پلّو لپیٹتی رہی۔ شاید یہ دکھ بانٹنے کی کوئی علامت ہو۔ لیکن ایسی علامتیں سب مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔

تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ چلی گئی۔

"میں جذبۂ محبت کے تحت ہی آگئی تھی !"

وہ لکھتی ہے

"مائی فٹ !"

لکھتی ہے

"تمہارے سینہ میں دل کی جگہ پتھر کی سِل ہے !"

کتنی مضحکہ خیز بات ہے۔ اب آپ ہی کہیئے کہ یہ بات سچ کیسے ہو سکتی ہے؟ اب سارا گھوش کو کون بتائے کہ اُس دن مجھے اُس پر کتنا ترس آیا تھا جب میں اُسے پہلی بار اپنے ساتھ کلب لے گیا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک دن مجھے خیال آیا کہ سارا گھوش بہت تنہا ہے اُس کی زندگی بے رنگ ڈبو ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے سوچا میں اسے اپنے ساتھ کلب لے جاؤں گا۔ اور اُس دن جب میں جیون داس مرن داس کمپنی میں اپنی ڈیوٹی ختم کر چکا تو میں نے اُس سے کہا "مس گھوش: تمہاری ڈیوٹی ختم ہو گئی نا۔؟"

"ہاں ڈاکٹر: مگر آپ کیوں پوچھتے ہیں۔؟"

"اگر تم برا نہ مانو تو میں آج کی شام تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں!"

"یعنی ——— ؟"

"یعنی یہ کہ ہم کسی جگہ بیٹھ کر تھوڑی سی کافی پیئں اور بہت سی باتیں کریں"

"زیادہ دیر تو نہیں ہو جائے گی؟"

"نہیں، بس یہی کوئی گھنٹہ بھر دیر سے گھر پہنچو گی۔"

اُس نے کچھ نہیں کہا۔

اور میرے ساتھ آکر کار میں بیٹھ گئی۔ میں اُسے کلب لے گیا ایک خالی کونے میں بیٹھ کر میں نے کافی کا آرڈر دیا۔ لیکن باتیں نہ ہو سکیں۔ وہ گم سُم ہی بیٹھی رہی اور دُز دیدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتی رہی فلور پر کچھ لوگ ڈانس کر رہے تھے۔

" یہ سب لوگ شادی شدہ ہیں میرا مطلب ہے یہ سب عورتیں ان مردوں کی بیویاں ہیں جن کے ساتھ یہ ناچ رہی ہیں ؟"

اُس نے سرگوشی میں پوچھا

" نہیں ! کچھ شادی شدہ ہیں . کچھ کنوارے ہیں۔"

" پھر ایک دوسرے کے ساتھ کیسے ناچ رہے ہیں . ؟ "

کیوں اس میں کیا بات ہے ! ہم سب لوگ یہاں فرینڈس ہی تو ہیں۔"

اُس کے ہونٹوں کے زاویئے بدل گئے اُس کے ماتھے پر تیوریاں چڑھ گیئں ۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر ہنسی آگئی ۔ اور اسی وقت مسز جیپ والا کی نظر ہم پر پڑ گئی ۔

" ہلو گوتم ڈیئر ! "

اس نے آواز دی ۔

" ہلو سویٹی ! "

" تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو ۔ آؤ فلور پر ۔ یہ کون ہے ؟ "

میں نے اس کا تعارف کرایا ۔

مسز جیپ والا نے مجھے ایک طرف لے جا کر ڈانٹا

" یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے گوتم ؟ اس دیہاتن میں آخر تمہیں کیا نظر آیا ! مائی گاڈ کتنی بلین لڑکی ہے ! "

مجھے مسز جیپ والا کی اس بات پر سخت غصہ آیا آخر اُسے کسی

کو ذلیل کرنے کا کیا حق ہے بے چاری سارا گھوش۔ بے شک پلین ہو لیکن یہ کیا کہ اسے کلب میں دیکھ کر لوگ بندروں کی طرح منہ بنائیں اس وقت تو یہ میری فرینڈ ہے اور میری فرینڈ کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا اور مجھے بے چاری سارا گھوش پر بے حد ترس آیا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں مجھے اس سے بے حد محبت ہو گئی ہے۔

غور کیجئے مجھے جس لڑکی نے اپنے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا ہو کبھی کوئی ڈیٹ نہ دی ہو کبھی میرے ساتھ کوئی رومانس کی بات نہ کی ہو، وہ یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اسے مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ اب یہی دیکھئے مجھے اس سبرب میں رہتے ہوئے پورے دس مہینے ہو گئے ہیں لیکن آج سے پہلے اس کا کوئی خط تک نہیں آیا

مگر ٹھہریئے میں بیچ کا ایک واقعہ آپکو بتانا بھول ہی گیا چاہیئے تو یہ تھا کہ میں پہلے ہی اس بات کی وضاحت کرتا۔ خیر بات یہ ہے کہ جیون داس، مرن داس کمپنی میں دو سال کام کرنے کے بعد مجھے اس گندے سبرب میں میڈیکل آفیسر بنا کر بھیج دیا گیا ہے اور یہاں میں پورے دس مہینے سے پڑا ہوں۔ یہاں نہ کوئی کلب ہے نہ سینما ہے نہ ڈھنگ کے مریض ہی ہیں میں تنگ آ گیا ہوں۔ یہاں بڑے بڑے جدھر دیکھو دھوتی اور کرتا ہی نظر آتا ہے کوئی بھی چار منگ ضیں نہیں۔ یہاں صرف میں ہی کوٹ پتلون پہنتا تھا۔ اس لئے تنگ آ کر اب انتقام کے طور پر دھوتی اور کرتا پہننا شروع کر دیا ہے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ یہاں

کی ساری لڑکیاں سارا گھوش نظر آتی ہیں۔ میں نے یہاں آکر سارا گھوش کے بارے میں سوچا ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں سارا گھوش میں دلچسپی لینے لگا ہوں۔

اب دیکھئے جس دن میں یہاں آیا تو ایک دن پہلے سارا گھوش میرے ساتھ کلب آئی تھی۔ گم سم سی بیٹھی رہی۔ میں نے اس کا دل بہلانے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ بجھی بجھی سی رہی۔ پھر چلتے ہوئے میں نے بڑا ہی [illegible] دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ سی گئی تھیں۔ بس اس بات سے مجھے چونکہ سارا جیسی لڑکیاں روتی زیادہ ہیں۔ اور محبت کم کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ یہ جو سارا کی چٹھی میرے سامنے ہے۔ اور جس کی چند ہی سطریں ابھی تک پڑھ سکا ہوں اس پر بھی جگہ جگہ آنسوؤں کے نشان ہیں۔

لکھتی ہے۔

"یہ میرا پہلا خط ہے جو میں نے اس موضوع پر لکھا ہے اور شاید آخری بھی۔ یقیناً تمہارے جیسے آدمیوں سے مجھے شدید نفرت ہے لیکن کوشش کے باوجود میں اپنے دل میں تمہارے لئے کوئی نفرت کا جذبہ نہ ابھار سکی۔ تم وہ پہلے آدمی ہو جس سے مجھے محبت ہو گئی ہے اور تم ہی وہ آخری آدمی ہو جس کی محبت کو سینے سے لگائے میں مر جاؤں گی"۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی دوسرے آدمی سے محبت نہیں کرے گی۔ یعنی اپنے ہونے والے ہسبنڈ کے ساتھ بھی نہیں کرے گی؟

واٹ اے سوئیڈ گرل!

اب میری ہی بات لیجیے۔ میں نے اب تک نہ جانے کتنی لڑکیوں سے محبت کی ہے لیکن اُس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اپنی ہونے والی ننانسی کے ساتھ محبت نہ کروں۔ وائلنٹ !
مگر سارا گھوش ؟ آخر وہ کیوں کہتی ہے کہ اُسے مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ مجھے اس بات پر غور کرنا پڑے گا کہ کیوں نہ ایسا چھوٹا خط لکھنے والے کو قانون کے حوالے کیا جائے ؟
مگر . . . مگر یہ بیچ میں شادی کی بات کیوں آگئی ؟ کہیں یہ بات تو نہیں کہ سارا گھوش کو مجھ سے اس لئے محبت ہو گئی ہے کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے ! اُف ، میں کتنا بے وقوف ہوں۔ وہاٹ اے ڈیم فول !
مجھے چاہئے تھا کہ ابتدا ہی سے اس سارے معاملہ کو اسی پس منظر میں جانچتا مگر میں کیا کروں ! بس ایسی باتوں کی تربیت ابھی ایسے کلبوں یا ایسے سرکلوں میں ملی ہے جہاں لڑکے اور لڑکیاں شادی اور ایسی ہی دوسری باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ اپنی گرل فرینڈ کو سینما لے جاؤ اُن کے ساتھ کلبوں میں ڈانس کرو۔ اُن کے ساتھ رومانس کرو۔ مگر شادی کا لفظ تک زبان پر نہ لاؤ۔ اپنے بوائے فرینڈ سے تحفے وصول کرو۔ اُن کے ساتھ بیئر پیو۔ اُس کی دست درازیاں تک برداشت کرو۔ مگر شادی کی بات نہ سنو۔ نہ کہو۔ اور نہ دیکھو۔
اب جب مجھے خیال آتا ہے۔ تو بہت سی ایسی باتیں ضرور ہیں جن

کی روشنی میں سارا گھوش کا یہ خط دوسرے معنی رکھتا ہے۔

بے چاری سارا گھوش کا کوئی قصور نہیں۔ اُس نے ضرور کچھ میری آنکھوں میں پڑھ لیا ہوگا۔ اُس نے میرے کسی انداز سے کچھ بھانپ لیا ہوگا۔ اب اُس دن جب ماں کا خط آیا تھا۔ اور جس میں اس نے لکھا تھا کہ میں اُسے بہو تلاش کر رہے ہیں مدد دوں تو میں جیون داس مرن داس کمپنی میں بیٹھے بیٹھے دیر تک سارا گھوش کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ کیوں؟

اور جب میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے اُس کی حالت پر ترس آتا تھا تو یہ ترس ہرگز نہ تھا۔ تو پھر میں کیسا ڈاکٹر ہوں جسے اپنی نفسیات کا کوئی علم نہیں۔ ؟

اور وہ جو کبھی سارا گھوش کی یاد آجاتی۔ تو میں اپنے گھر کے بارے میں سوچنے لگتا تھا جہاں میری ماں اکیلی رہتی ہے۔ اور جس کے آنگن میں تلسی کا ایک پودا ہے، تو ــــــ تو

اور وہ جو کسی شام کو اچانک کوئی لڑکی دیکھ کر مجھے سارا گھوش کے لمبے لمبے بالوں کا خیال آتا تھا۔ اور میں یہ چاہنے لگتا تھا۔ کہ اِن بالوں کو چھو کر دیکھوں تو وہ کون سا جذبہ تھا۔؟ اب جو میں سوچنے لگا ہوں تو مجھے صرف سوچنے دیجیے۔

ابھی مجھے بہت سے کام کرنے ہیں مجھے انڈین ایر لائنز دیکھ کر یہ دریافت کرنا ہے کہ شہر جانے والی پہلی گاڑی کب چھوٹتی ہے۔ اُس کے بعد شہر جا کر جیون داس مرن داس کمپنی میں سارا گھوش سے ملنا ہے اور اُس

ہے کہنا ہے کہ تم نے اپنے خط میں بالکل غلط بیانی سے کام لیا ہے تمہارا یہ کہنا کہ تم پچھلے تین سال سے مجھ سے محبت کرتی رہی ہو۔۔۔ بالکل جھوٹ ہے حقیقت یہ ہے کہ پچھلے تین سال سے غیر شعوری طور پر میں خود تم سے محبت کرتا رہا ہوں ——————

تمہاری خوشبو سے محبت کرتا رہا ہوں۔

تمہاری سادگی اور معصومیت سے محبت کرتا رہا ہوں۔

تمہاری محبت سے محبت کرتا رہا ہوں۔

میں اُس کے ساتھ اور کون کون سی باتیں کروں گا وہ آپ کو بتانے کی بات نہیں۔

رہ گئی اس خط کی بات ——————

تو آپ ہی بتائیے کہ حالات کے اس نئے موڑ کے پیش نظر میں آپ کو اس کا باقی حصہ کیسے سُنا سکتا ہوں۔؟

ڈل کے باسی

خورشی کا ننھا اس کی چھاتیوں سے دودھ نچوڑتے نچوڑتے تھکا ہارا گیا اور
تھک کر سو گیا۔ خورشی نے جلدی جلدی اسے ناؤ میں بچھے ہوئے چٹائی کے
ایک ٹکڑے پر سلا دیا اور خود کھڑی ہو گئی۔ کھڑے کھڑے اس نے جھیل کے
چاروں طرف، دور دور تک، نگاہیں پھیلا دیں۔ باقی مچھیرے اپنی اپنی ناؤ کے
سرے پر نیزے لیے پانی کی گہرائیوں میں نظریں گاڑے چپ چاپ بتوں
کی طرح کھڑے تھے۔ کبھی کسی کا نیزہ ایک سخت حرکت میں آتا۔ دوسرے
لمحے کوئی مچھلی لہروں پر تڑپتی نظر آتی۔ اور کسی کے ہونٹوں پر ایک ثانیہ کے
لیے ہنسی جھلک اٹھتی ـــ اور پھر سکوت چھا جاتا۔ خورشی تھوڑی دیر
ان کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے سوچا یہ کام کتنا صبر آزما ہے مچھیرے جھیل کے
انتظار میں کھڑے کھڑے بہت وقت بیت جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ٹرناگون

میں دھیمی دھیمی اینٹھن کا احساس ہونے لگتا ہے، یا نارز پکڑے پکڑے شل ہو جاتے ہیں، آنکھیں گہرائیوں میں جھانکتے جھانکتے پتھرا جاتی ہیں اور ہمت انتظار کرتے کرتے ٹوٹ سی جاتی ہے۔ لیکن آدمی اس کے باوجود چپ چاپ، کھڑا ہی رہتا ہے کیوں؟ اسی وقت نہ جانے کیوں شام کا خیال آتا ہے۔ چولھے کا خیال آتا ہے، بچوں کا خیال آتا ہے۔ اور آدمی شدت سے چاہنے لگتا ہے۔ کاش! کوئی مچھلی نظر آئے۔ ایک ہی مچھلی صرف! تاکہ نارز اپنا وار کرے اور ٹانگوں کی اینٹھن، بازوؤں کی بے حسی اور نگاہوں کی تھکاوٹ سب ایک لمحے کے لئے کافور ہو جائے۔

اس نے جلدی سے اپنا نارز سنبھالا۔ اور ناؤ کے سرے پر کھڑی ہو گئی۔ اور پھر ساکت کھڑی رہ گئی۔ اس کی نظریں جھیل کی گہرائیوں پر جم گئیں۔ جھیل کی گہرائیوں میں جھانکتے ہوئے، پانی کی تمام نیلاہٹ اس کی پتلیوں میں بھر گئی۔ جھیل کی تہ میں کائی کے آس پاس اسے مچھلیاں تیرتی نظر آئیں۔ وہ چاہنے لگی کہ کوئی مچھلی ذرا سی دیر کے لئے تھوڑی سی ابھر آئے، تو وہ اپنا نارز اس کے جسم میں گھونپ دے اور اسے اٹھا کر کشتی میں ڈال دے لیکن ان مچھیروں کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ سب اوپر والے کی مرضی پر ہی منحصر ہے۔

جھیل میں جھانکتے جھانکتے خورشی کو پانی کی شفاف سطح پر اپنی صورت بھی دکھائی دی۔ اپنی صورت دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے رک سی گئی، ٹھہر سی گئی۔ وہ پھر اپنی صورت کو دیکھنے لگی۔ جو پانی کی شفاف سطح پر

پر تھرک رہی تھی۔ اُس نے دیکھا اُس کے سر پر بندھی ہوئی اوڑھنی ٹھیک ۔ اسر
کے اوپر پہنچی ہوئی ہے اُس نے جلدی سے اوڑھنی کھول کر پھر سے باندھ لی
ایسا کرتے ہوئے اس کے بال سورج کی روشنی سے چمک اُٹھے اور ان کی
چمک لہروں میں نئی تیرگی پیدا کرنے لگی ۔ اُس نے ٹھوڑی کے پاس کا وہ تل بھی
اس پانی میں نظر آیا اور اس نے غیر ارادی طور پر اسے بائیں ہاتھ کی انگلی
سے چھو کر دیکھا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے گالوں پر لالی بکھر گئی۔ اور اُس
کا عکس پانی میں بھی تھرک گیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے شرما گئی۔ کہیں دیکھا تو نہیں
کسی نے ؟ اُس نے جھیل کے چاروں طرف پھر نظریں دوڑائیں سبھی اپنے
اپنے کام میں لگے تھے یہاں فرصت ہی کسے تھی ؟ جو خورشی کی ٹھوڑی کے
کے تل کو دیکھنے لگتا سبھوں کو اپنے بچوں کی، ماں باپ کی ، بیویوں
کی فکر تھی۔ سبھی یہ چاہتے تھے۔ کہ کہیں سے چار چھ مچھلیاں ہاتھ لگیں تا کہ شام
کو چولہا جلے ۔ وہ یوں ہی ہنس پڑی۔ بہت دھیرے سے ۔ اور ایسا کرتے
ہوئے اُسے پانی میں اپنے چمکتے ہوئے دانت دکھائی دیئے غیر ارادی
طور پر اُس نے اپنے دانتوں پر زبان پھیری۔

اُسی وقت ایک مچھلی نے جیسے کروٹ سی لی خورشی کو اُس کا پیلا پیٹ
دکھائی دیا۔ یک لخت اُس کا نیزہ اچھلا — ایک چھپاکا ہوا۔ پانی میں دائرے
بن گئے ۔ ایک ہاتھ لپکا — اور دوسرے لمحے وہ مچھلی خورشی کی ناؤ میں تڑپ
رہی تھی اُس نے مچھلی کو چیل کے جھپٹے سے بچانے کے لیے چٹائی کے نیچے
چھپا دیا۔

ایسے ہی میں اس کی نظر ننھے کے چہرے پر ٹھہر گئی ننھا گہری نیند سو رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر فرشتوں کی سی مسکراہٹ ناچتے رینگتے ٹھہر سی گئی تھی۔ خورشی کے دل میں کوئی چیز چبھ سی گئی تھی۔ اسے خیال آیا۔ کہ ننھا بھوکا ہے۔ کیوں کہ وہ خود کل سویرے سے بھوکی تھی پچھلے تین دنوں میں کچھ ملا ہی نہ تھا۔ ان مچھیروں کو جب دن میں کچھ ملے تبھی شام کو چولہا جلتا ہے اور ماں بھوکی ہو تو بچے کے لیے چھاتیوں سے دودھ ہی کتنا اترتا ہے ننھے کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی نظروں میں ماں کا سارا پیار بکھر گیا۔ ساری ممتا چھلک پڑی اس نے سوچا میری چھاتیوں میں اگر دودھ کم ہے، تو خون کیوں نہیں اترتا۔

اس نے ننھے کے چہرے سے اپنی نگاہیں ہٹا دیں اور ٹارچ ہاتھ میں سنبھال کر پھر ناؤ کے سرے پر کھڑی ہو گئی۔ اور کھڑے کھڑے پھر جھیل کی گہرائیوں میں اپنی نگاہیں جما دیں اس نے پھر کائی کے ارد گرد تیرتی ہوئی مچھلیوں کو دیکھا۔ وہ ویسے ہی تیر رہی تھیں حالانکہ اب ان میں ایک کی کمی ہو گئی تھی لیکن دنیا میں کون کسی کی کمی کو محسوس کرتا ہے اپنی اپنی زندگی کی فکر سب کو ہوتی ہے۔ وہ اچانک چونک اٹھی۔ دنیا میں کون کسی کی کمی کو محسوس کرتا ہے۔ اس کی زندگی میں بھی ایک خلا تھا۔ ایک کمی تھی جبار کی۔ اس کے اپنے خاوند کی جو چار مہینے سے پنجاب گیا ہوا تھا، نوکری کرنے جبار کی یاد آتے ہی خورشی کے ہاتھ میں ٹارچ تڑپ سا اٹھا۔ اس نے جلدی سے نگاہیں اس کائی سے ہٹا لیں جس کے ارد گرد مچھلیاں اب بھی بے نیازی

سے تیر رہی تھیں جیسے وہ اپنے آپ کو مچھلیوں کے اس زمرے سے الگ رکھنا چاہتی ہو، جو ایک ساتھی کی کمی کو محسوس نہیں کرتی تھیں۔ ــ سطح پر پھر سے اپنا چہرہ ابھرتا ہوا دکھائی دیا ــ

اور اچانک ہی اس چہرے کے ساتھ دوسرا عکس بھی کہیں سے آکر ٹھہر نہ سکا ــ وہ چونک سا گئی۔ اس نے نظر اٹھا کے دیکھا تو سامنے ایک مچھیرا اپنی ناؤ کے سرے پر ہاتھ میں ناؤ ڈنڈا لیے کھڑا تھا۔ اور دھیرے دھیرے مسکرا رہا تھا۔ تندرستی کا جوان چہرہ لالیوں سے بھر گیا

" مچھلا ــ ؟" مچھیرے نے پوچھا

" تھوڑا بہت! " خورشی نے بے رخی سے جواب دیا۔ آدمی اب بھی مسکرائے جا رہا تھا جانے کیوں؟ اس کے دانت سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔

" میں کچھ مدد کروں؟ " اس نے پھر کہا اور اس کے چہرے پر یہ کہتے کہتے ایک عجیب سا تناؤ سا آگیا۔

" کیوں؟ ــ میرے بھی ہاتھ پاؤں ہیں"۔ خورشی نے تلخی سے جواب دیا اسے مچھیرے کی یہ ہنسی بہت بری معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں اسے کوسا، دیدے پھوٹ پڑیں تمہارے ــ مچھیرے نے اپنی ناؤ تھوڑی سے آگے بڑھا دی اور خورشی نے دیکھا، اس کی ناؤ میں بہت سی مچھلیاں ہیں۔ اس کی آنکھوں سے ایک عجیب کم مائیگی کا احساس جھلکنے لگا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا یہ آدمی بڑا قابل ماہی گیر نظر آتا ہے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ آدمی نے جاتے جاتے کہا

" اللہ کی قسم! ڈل جھیل سے بھی زیادہ اچھی ہو ــ!"

خورشی کو غصہ چڑھتا گیا! "جانے کیا سمجھا ہے مجھے منحوس!" اور

وہ عکس پانی کی سطح سے غائب ہو گیا۔

لیکن یہ تو بہت پرانی بات تھی۔ ان دنوں وہ اپنی ماں کے ساتھ جھیل پر آیا کرتی تھی۔ اور ان دنوں اس کا بیاہ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ جب سے آج تک بہت سی چیزیں بدل گئی تھیں۔ وہ پھیرا بھی بدلا تھا۔ اور جبار ابن گیا تھا اس کا اپنا جیون ساتھی! خورشی کی آنکھوں سے یوں ہی آنسو نکل پڑے اور پانی میں تحلیل ہو گئے۔ اس نے جلدی سے آنسوؤں کو پونچھ ڈالا۔ نہ جانے جبار کی یاد آتے ہی اس کی آنکھیں برسنے کیوں لگتی ہیں۔

سورج اب سر پر آگیا تھا۔ اور ابھی تک نہ وہ ایک مچھلی پکڑ سکی تھی۔ اس نے آس پاس کی پہاڑیوں کی طرف دیکھا جو چپ چاپ کھڑی تھیں جیسے وہ بھی مچھلیوں کی تاک میں ہوں۔ تھوڑی دور دونشہ کدل کا پل ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے جھیل کے بیچ میں اونٹ بیٹھا جگالی کر رہا ہو۔

خورشی زندگی بھر لہروں اور مچھلیوں سے آنکھ مچولی کھیلتی رہی تھی وہ بہت چھوٹی سی تھی۔ ان دنوں جب اس کا باپ رسول اسے اپنی ناؤ میں بٹھا کر جھیل کی طرف لے جاتا تھا۔ ان دنوں وہ ایک گندی سی لڑکی تھی۔ جس کی ناک ہر دم بہتی رہتی تھی۔ وہ ناؤ کے سرے پر بیٹھے بیٹھے چھوٹی بڑی مچھلیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی کبھی کسی تڑپتی ہوئی مچھلی کو پانی میں چھوڑ کر دور تک اس کا تیرنا دیکھتی رہتی اور تالیاں بجا بجا کر اپنی توتلی زبان میں کچھ بکتی رہتی تھی۔ رسول مچھلیاں چھوڑ دینے پر اسے تھپڑ اور لات سے نوازتا تھا۔ [illegible] رہتی تھی تو روتے روتے ہی کھیلنے جاتی تھی۔

اور اُس کا باپ ناؤ کے سرے پر کھڑے کھڑے اکڑ جاتا تھا۔ اُسے مچھلیوں کا انتظار کرتے کرتے تھک سا جاتا۔ اور وہ آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر ایک آہ بھرتا۔ خدایا کیا آج شام کو میرے گھر چولہا نہ جلے گا۔ لیکن ان دنوں خورشی یہ کہاں جانتی تھی۔ کہ چولہا نہ جلنے سے کیا ہوتا ہے مچھلیاں نہ پکڑنے سے کیا ہوتا ہے بہت چھوٹی سی تھی نہ تب تو—

پھر جب وہ کچھ بڑھ گئی تھی۔ تو اسے دن بھر اپنے جھونپڑے میں بیٹھ کر اپنے چھوٹے بھائی کی خبرگیری کرنی پڑتی تھی۔ وہ جھونپڑے میں بیٹھی بیٹھی اکتا جاتی تھی۔ اپنی ماں کو دل ہی دل میں کوستی رہتی تھی۔ اپنے چھوٹے سے بھائی ممدو کو اتنا مارتی تھی۔ کہ وہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا کرتا تھا—

اور اُس کی ماں دن بھر ٹوکرے میں مچھلیاں رکھے شہر کے گلی کوچوں کے چکر لگاتی رہتی تھی— اور شام ہوتے تھکی ہاری نیم جان سی۔ زخم خوردہ سی مٹھی میں چند سکے دبائے گھر کو لوٹ آتی تھی— اور ننھے ممدو کو روتا دیکھ کر خود بھی رونے بیٹھ جاتی تھی— بس یہی اُن کی ساری زندگی تھی— ساری کائنات تھی۔

اُس کے بعد جب وہ اور بڑی ہو گئی تو ماں کے ساتھ شہر جانے لگی تھی اور گندا سنگھ کے غلیظ اور بدبودار کوچے سے متعارف ہوئی تھی۔ جہاں وہ بیٹھے بیٹھے چلاتی رہتی تھی—

"ڈل کی مچھلیاں، چودہ آنے سیر!"

پھر دو چیزیں ایک ساتھ ہوئی تھیں۔ جوانی آئی تھی اور باپ گیا تھا۔ باپ کے مرجانے کے بعد اس کی ماں جھیل پر مچھلیاں پکڑنے جاتی تھی۔ اور وہ اکیلی گندا سنگھ کے مکروہ اور بدبودار کوچے میں مچھلیاں بیچنے جاتی تھی—

اسی تاریک کوچے میں وہ پہلی بار مفلسی کے اتار چڑھاؤ سے آگاہ ہوگئی تھی۔ یہاں کتنے ہی لوگ دن بھر آتے جاتے رہتے تھے اور کبھی ان نگاہیں اس کے پھٹے ہوئے فرن سے گذر کر اس کی جوانیوں کو تاکا کرتی تھیں۔ تبھی اس کے دل میں ایک نامعلوم خوف سا گھر کر گیا تھا اور اس نے اپنے سینے کو چھپا کر رکھنا سیکھا تھا۔ اپنے پاؤں کو میل اور گندگی اور دھول کی تہوں میں چھپانا سیکھا تھا۔ اسی کوچے میں اس کے تصور نے جنم لیا تھا۔ اس تصور نے جو ہر جوان اور مفلس لڑکی کے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ کہیں کوئی راہ چلتا لوٹ نہ لے، کہیں کوئی بے باک نگاہ دل کے پردوں کو چیر کر اندر نہ گھس آئے کہیں کوئی گستاخ ہاتھ بڑھتا بڑھتا آگے ہی نہ بڑھ جائے کہیں کوئی منچلا بانہہ پکڑ کے بانہہ ہی نہ مروڑ دے۔

یہیں اس نے میونسپلٹی کے جمعدار کو ایک آنہ رشوت دینا بھی سیکھ لیا تھا۔ اسی کوچے میں اس نے اپنے خوابوں کے تانے بانے بھی تیار کرتے، پھولوں کی گل کاریاں اپنے تصور کے دریچوں میں سجائی تھیں پھر ایک دن کسی دریچے سے موت آن ٹپکی تھی۔ اور آن واحد میں اس کی ماں کو دبوچ کر لے گئی تھی۔ ۔۔۔ اور اسے ناؤ کا سہارا لینا پڑا تھا۔ جھیل کی چنچل لہروں میں پناہ ڈھونڈھنی پڑی تھی۔ لہروں اور جھیلوں کا شریر کھیل دیکھنا اور کھیلنا پڑا تھا۔

جھیل پر منڈلاتے بادل پکڑتے پکڑتے اس کے تصور نے چند نئی بلندیوں کو پکڑنا چاہا تھا۔ اس کی خواہشات نے اسے اکسانا شروع کیا

تھا۔ کرتے سے بھی کہیں سے ایک نیا فراک مل جائے جس کے گریبان پر زرکاری کا کام کیا ہوا ہو۔ ایک نئی انگوٹھی مل جائے جس میں مصنوعی تارے ٹکے ہوں ایک کنگھی کہیں سے ہاتھ لگے جس سے وہ اپنے سیاہ بالوں کو روز سنوار سکے۔ اُس کے بھائی کے لیے ایک نئی قمیص مل جاتے جسے پہن کر وہ شہر کے گلی کوچوں میں مچھلیاں بیچتا پھرے۔ کہیں سے ایک سماوار مل جائے تاکہ وہ بھی دوسرے مچھیروں کی طرح اپنی ناؤ میں بیٹھ کر اپنے لیے نمکین چائے بنا سکے۔

لیکن جہلم ہی پر اُس نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ یہ سب خواہشیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ دن بھر آٹھ دس آنے کی مچھلیاں تو کل بک جاتی تھیں اور یہ آٹھ دس آنے صرف پیٹ کی آگ بجھانے کے کام آتے تھے۔ اِس احساس کے بعد اُس نے مفلسی کے تلخ جام کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔ جس کی تلخی جب سے آج تک برابر اُس کی رگوں میں اور شریانوں میں دوڑتی آئی تھی۔

انہی دنوں کے بیچ ایک دن اُس نے جبارا کو دیکھا تھا۔ اور اُس کی دلہن بن گئی تھی۔ اور اپنے ہاتھوں میں مہندی لگائی تھی۔ اپنے بال سنوارے تھے اور اپنی آنکھوں میں کاجل کی گہری لکیریں بھر دی تھیں۔ اور اپنے ہونٹ دنداسہ کے چھلکوں سے لال کئے تھے۔ اسی جہلم کی گہرائیوں سے ایک دن اُس نے ننھے کو ابھرتا ہوا دیکھا تھا۔ اور اُس کے انگ انگ سے اُس کے استقبال کی تیاریاں پھوٹ پڑی تھیں۔ یہ ننھے کو لانا کتنا مشکل

نہیں تھا جتنا اُس کے لئے دودھ کا انتظام کرنا مشکل تھا جتنا اس کے لیے ایک چھوٹی سی کالے کپڑے کی ٹوپی دستیاب کرنا مشکل تھا جتنا اُسے پڑھانا مشکل تھا۔

اور اسی مشکل کا حل تلاش کرنے جبارا پنجاب مزدوری کرنے نکلا تھا۔ جبارا نے اُس دن کہا تھا۔ کہ وہ کچھ ہی مہینے بعد روپیہ لے کر لوٹ آئے گا۔ جس طرح اس سال جو آیا تھا — غفار چاچا آیا تھا — اور نہ جانے کتنے آئے تھے —

اُس کے جانے کے بعد خورشی کو سب کام کرنے پڑتے تھے۔ کھیل پر بھی جاتی۔ شہر کے گلی کوچوں کے چکر بھی لگا آتی۔ کبھی کبھی گنڈ اسنگھ کے تاریخی باغیچے میں بھی وہ ایک گھڑی بیٹھ جاتی۔ اس چڑیا کی طرح جو دن بھر دور دور تک اور کر دانہ تلاش کرتی ہے۔ اور شام پڑے اپنے گھونسلے کو لوٹ آتی ہے۔ اور اپنے بچوں کو اپنے تھکے ہارے پروں کے نیچے سنبھال کر سو جاتی ہے۔

پر اب کی بار مشکل یہ تھی۔ کہ ننھے کو ساتھ لے جانا پڑتا تھا۔ گھر میں کون تھا جس کے پاس چھوڑ آتی۔ ایک ممدو تھا۔ ماں باپ کی آخری نشانی، سو وہ ایک سال پہلے ایک رات گھر سے بھاگ گیا تھا۔ اور آج تک اُس کا کچھ پتہ نہ چلا تھا کہ کہاں ہے۔ یا ہے بھی کہ نہیں۔ اپنے اس اکلوتے بھائی کے لیے اُس نے کتنے ہی آنسو رات کی تاریکی میں بہائے تھے۔ لیکن آنسوؤں کا کیا۔ بہہ جاتے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں جب کوئی دیکھنے یا سننے

والا پاس نہیں ہوتا۔

اگر نہ وہ سوچتی جانے نہ ہی نہ دیا ہوتا جبار کو پردیس۔ کون جانے مجھ کا ہی نہ سوتا ہو وہاں ——

خورشی کی آنکھوں میں پہاڑیوں کی طرف، دیکھتے دیکھتے آنسو بھر آئے اُس نے ہتھیلی سے آنسو پونچھے اور ننھے کی طرف، دیکھنے لگی۔ ننھے کی طرف، دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں ایکبار پھر بھر آئیں۔ اس بار اُس نے اِن آنسوؤں کو بہنے دیا۔ بہہ ہی جائیں تو اچھا ہے۔ دل بھی کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اِس چہرے میں وہ اپنی ساری زندگی کی داستان دیکھ رہی تھی۔ حرف بہ حرف، اُس کی ساری کائنات، اس ننھے سے چہرے میں سمٹ آئی تھی۔ اور پھر اِس چہرے پر جبار کی شکل کا پرتو بھی تو تھا۔ خورشی کو ایسے میں ہی پرانی بات یاد آگئی۔ ان دنوں جبار بھی اُس کے چہرے پر نظریں جمائے اپنے ہی ساتھ باتیں کیا کرتا تھا، جب، کہ وہ سوئی ہوئی تھی۔ اچھی اچھی اور ننھی منی باتیں — اُس نے کئی بار جھوٹ موٹ ہی نیند کا بہانہ کرکے ان باتوں کو سُنا تھا۔ ان باتوں کو سن کر وہ کتنا شرماسی جاتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں خمار کی کتنی تہیں سی چڑھ جاتی تھیں۔ اور وہ اپنے سارے بدن میں کیسی عجیب سی کپکپاہٹ محسوس کرتی تھی

"کسی راجہ کے گھر میں ہوتی تو سکھ سے ہوتی۔ اچھے اچھے کپڑے پہنتی، چہکتی رہتی ...... میرے پاس کیا ہے، ایک چھوٹی سی ناؤ ہے۔ ایک ناراض

ہے اور دو ہاتھ ہیں۔"

ایسے میں کہی ہوئی مجبارا کی کتنی باتیں اسے یاد تھیں وہ اکثر جھیل کے کنارے ان باتوں کو یاد کر کے لوٹ پوٹ ہو جایا کرتی تھی۔ ایسے میں جھیل بھی کتنی دلکش نظر آتی تھی جیسے خوشی میں بہایا ہوا ایک آنسو پھیلتے پھیلتے پھیل ہی گیا ہو۔ لیکن آج ان باتوں کو یاد کر کے اس کی آنکھوں سے آنسو کیوں نکل آتے ہیں —— وہ لوٹ پوٹ کیوں نہیں ہو جاتی۔ —— آج جھیل بھی کیوں ایسی ہی دکھائی دیتی ہے جیسے کسی نوخیز بیوہ کے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو کی لکیر ——

اس نے بیٹے کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بہت دیر تک ان باتوں کو یاد کیا پر ننھا اپنی نیند ہی میں مسکرا رہا تھا۔ شاید اس کے خیالوں کا منہ چڑانے کے لئے اس نے دل ہی دل میں کہا خدایا! اس ننھی سی جان کو دنیا میں بھیجدیا تو کسی بڑے گھرانے میں ٹپکا دیا ہوتا۔ ورنہ اس سے بہتر تھا۔ کہ اسے یہاں بھیجتا ہی نہیں۔

لیکن یہ کہہ کر وہ تھر تھر کانپنے لگی "میرے جگر کا ٹکڑا!" اس نے اس کے ماتھے پر ایک انمول اور لازوال بوسہ ثبت کیا —— وہ جلدی سے اٹھی اور نارژ سنبھال کر پھر ناؤ کے سرے پر کھڑی ہو گئی۔ اور نگاہیں جھیل کی گہرائیوں میں ڈبو دیں۔

لمحے بیت گئے۔ اور ناؤ جھیل کی لہروں پر بہتی ہوئی تھر کتی رہی۔ خورشی نے کئی بار نارژ لہروں پہ دے مارا۔ پر کوئی مچھلی نہ تڑپی کھڑے کھڑے اسکی

ٹانگوں میں اینٹھن ہونے لگی۔ اس کے بازو شل ہونے لگے، اُس کی نگاہیں پتھرانے لگیں۔ لیکن وہ کھڑی ہی رہی۔ اُس نے سوچا اگر یوں ہی کھڑے کھڑے میں سر سے پیر تک، اکڑ بھی جاؤں جب بھی ہار کر نہیں بیٹھوں گی، تاکہ بعد میں کوئی یہ نہ کہے کہ جبار کے بعد خورشی سے اپنا آپ سنبھالا نہ گیا۔

اُس نے کھڑے کھڑے ہی پھر جھیل کے چاروں طرف اپنی نگاہیں دوڑائیں چند مچھیرے تھکے، ہار کر اپنی اپنی ناؤ کے سروں پر بیٹھ کر سُستانے لگے تھے کچھ بگلوں کی طرح گم سُم سے کھڑے ہی تھے۔ کسی ناؤ سے سماوار کی نالی بھاپ چھوڑ رہی تھی۔ خورشی نے فوراً اپنی نگاہیں وہاں سے پھیر لیں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی ہمسایہ مچھیرن ہمدردی کے جذبہ کے تحت، چائے کی ایک پیالی کے لئے اصرار کرے۔ چائے کی طلب، تو اُسے بھی ہو رہی تھی۔ لیکن جب اپنا سماوار ہی نہیں تو اس طلب کا گلا گھونٹ دینا ہی اچھا ——— کل کلاں یہی عورتیں کہیں گی۔ ہمارے ہی ٹکڑوں پر کم پل کے اتنے دن گزار دیئے۔

اُس نے چپو سنبھال کر ناؤ کو دھیرے دھیرے کھینا شروع کیا۔ ناؤ جھیل کی لہروں پر شپ شپ کرتی ہوئی، پانیوں کو چیرتی ہوئی ڈونڈہ کدل کی طرف جانے لگی۔ اُس نے سوچا پُل کے نیچے اُسے ضرور کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ آج تو ضرور ہی کچھ ملنا چاہئے۔ کیونکہ آج سویرے سے ننھے کا پیٹ اچھی طرح سے بھرا نہیں تھا۔

"پُل کے نیچے پہنچ کر اُس نے چپو چھوڑ دیا۔ اور ایک بار پھر ناریہ سنبھالے کھڑی ہو گئی۔ پُل کی محراب، پر ایک رام چڑیا اس سے پہلے ہی تاک میں بیٹھی

تھی۔ کہ کب کوئی چھوٹی سی مچھلی سطح کے قریب آئے اور کب وہ ڈبکی لگا کر اُسے پکڑ کر لائے۔ خورشی نے پیار سے اس رام چڑیا کی طرف دیکھا اُس کے بھی بچے ہوں گے۔ بیچارے کے۔ اور کون جانے وہ بھی ننھے کی طرح بھوکے ہی ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے رام چڑیا نے ڈبکی لگائی اور دوسرے لمحے اپنی لمبی سی چونچ میں ایک چھوٹی مچھلی پکڑ کے اپنے پر تولنے لگی۔ لیکن مچھلی اُس کی چونچ سے پھسل کر پھر پانی میں آگری اور لہروں میں غائب ہو گئی۔ اس کے پر جیسے ٹوٹ سے گئے۔

خورشی کا کلیجہ جیسے منہ کو آگیا۔ اُس نے شدتِ غم سے اپنا ہونٹ کاٹ دیا۔ پر ساتھ ہی اُسکا نارڑ اچھلا پانی میں دائرے سے بن گئے۔ ایک جھٹکا ہوا ایک ہاتھ لپکا — اور دوسرے لمحے ایک بڑی سی مچھلی اُس کی ناؤ میں تڑپ رہی تھی۔ خورشی نے بغیر دیکھے ہی محسوس کیا۔ کہ رام چڑیا حسرت سے اُس کی طرف دیکھ رہی ہے۔

سُورج ڈوبنے کے قریب آگیا ننھا اور خورشی کا ننھا نیند سے جاگ پڑا۔ اُس نے نارڑ ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور کھٹے ہوئے فرن سے چھاتی نکال کر ننھے کو دودھ پلانے لگی۔ دودھ پلاتے پلاتے اسے یہ احساس اب بھی کھائے جا رہا تھا۔ کہ چھاتیوں سے بہت کم دودھ نکلتا ہے یہ احساس ننھے کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا۔ جو دودھ نچوڑتے نچوڑتے ماں کے چہرے کو تک رہی تھیں

جیسے کہہ رہی ہوں، ماں! آج ان شکموں میں دودھ کیوں نہیں؟ کیا ہوا جس سے یہ تجبرنے سوکھ گئے۔ — یہ تو صرف میرا حق تھا کس نے چھین لیا۔

دودھ پلاتے پلاتے خورشی کو سارا بدن تھکن سے چور چور ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس کا انگ انگ دُکھنے لگا۔ — اور اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ —

آج صبح سے اُس نے تین مچھلیاں پکڑلی تھیں! وہ قدرے خوش تھی کیونکہ پچھلے دو دن خالی گئے تھے اُس نے سوچا مچھلیاں تقریباً کوئی ڈیڑھ سیر کے قریب ہیں۔ اور وہ چاہنے لگی کاش ہیں کوئی خریدار مل جائے، تاکہ وہ اونے پونے داموں انہیں بیچ کر تھوڑا سا دودھ لے آئے۔ اور اپنے لئے کچھ چاول بھی — ورنہ دوسرے دن تک انتظار کرنا پڑتا۔ اور پھر شہر جانا پڑتا۔ — گلی کوچوں میں ماری ماری پھرنا پڑتا۔ دیر تک وہ یونہی آنکھیں بند کئے منے کو دودھ پلاتی رہی۔ —

" او مچھلی والی! مچھلیاں ہیں؟" کسی نے آواز دی۔ وہ چونک اُٹھی اور آنکھیں کھول دیں۔ سامنے سے ایک شکارا شاید نشاط باغ سے آرہا تھا۔ شکارے ہی میں بیٹھا ہوا کوئی آدمی پوچھ رہا تھا۔

"ہاں ہیں —" اُس نے جلدی سے کہا اور بچے کو دھیرے سے ناؤ میں رکھ کر چپو سنبھال ناؤ کو کھینے لگی۔ اُس کے انگ انگ کی تکان کافور ہو گئی۔ وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر بجالائی کہ خریدار بھی مل گیا۔

" کیسی ہیں بڑی کہ چھوٹی؟" اُس آدمی کا شکارا اب نزدیک آ گیا تھا۔

" بڑی ہیں۔ کوئی ڈیڑھ سیر کے قریب۔ ہیں ساری کی ساری۔" خورشی

نے چٹائی کے نیچے سے تینوں مچھلیاں باہر نکال کر دکھائیں۔

"کتنے پیسے دو گی ۔۔۔؟" آدمی نے مچھلیوں کو ایک سا نظر دیکھتے ہوئے کہا

"شام کا وقت ہے اس لئے ایک ہی روپیہ دے دو" خورشی نے سوچا کہ لاہی جائیں تو اچھا ہے

"ارے ایک ۔۔ روپیہ؟ تین ہی تو مچھلیاں ہیں ۔۔۔" آدمی نے قدرے زور سے کہا حالانکہ وہ یہ بخوبی جانتا تھا کہ بازار میں کسی حالت میں بھی یہ ڈیڑھ روپیہ سے کم میں نہ ملیں گی۔

اری کیا کہتی ہو تم! ایک روپیہ اور تین مچھلیوں کا۔ توبہ!" تنگا سے کے ہانجی نے بھی کہا۔ شاید اپنی سواری کو خوش کرنے کے لئے۔ خورشی کو غصہ آگیا۔ لیکن غریب کا غصہ ہی کیا۔ غریب تو خود دنیا بھر کے غصہ کا شکار رہتا ہے۔

"تمہارے بیچ میں بولنے کی کوئی ضرورت نہیں!" اس نے ہانجی کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آٹھ آنے دوں گا ۔۔۔ منظور ہو تو دے جاؤ ۔۔۔" آدمی کہہ رہا تھا خورشی کے لبوں تک کوئی تلخ لفظ آتے آتے رک گیا۔ اس نے سوچا کہ آٹھ آنے تو کچھ بھی نہیں اسے دن بھر کی اینٹھن اور تھکن یاد آئی۔ اپنی ساری محنت سامنے کھڑی نظر آئی۔ انکار کر دوں اس نے فیصلہ کیا لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ انکار کے معنی ہیں اسے آج شام کو بھی بھوکے پیٹ سونا پڑے گا۔ اور ننھے کا دودھ بھی نہیں آئے گا۔ اس نے زبان سے کچھ کہا نہیں بلکہ دھیرے سے یہ تین مچھلیاں، دن بھر کی محنت اٹھا کر تنگا سے میں رکھ دیں۔

آدمی نے اپنی جیب ٹٹولی اور آہستہ سے ایک اٹھنی نکال کر خورشی کی طرف بڑھا دی۔ جیسے یہ اٹھنی دینا بھی اُسے پسند نہ آتا ہو — پر وہ کیا، کسی کو بھی غریب کی محنت کا معاوضہ دینا پسند نہیں آتا۔

ٹکڑے کو ہلکی سی حرکت ہوئی۔ آدمی کا ہاتھ قدرے پیچھے سرک گیا — اور اٹھنی خورشی کے منتظر ہاتھ میں پہنچنے سے پہلے ہی پانی میں گر گئی پانی کی سطح پر ایک چھوٹا سا دائرہ بن گیا۔ ایک ہلکی سی ہل چل مچ گئی۔ اور اٹھنی دھیرے دھیرے نہ کی جانب اترنے لگی۔ ٹکڑے کے پانی کی آنکھوں میں صرف ایک لمحہ کے لئے تحتمندی کی شعاع چمک گئی — اور فوراً ڈوب گئی —

خورشی کو دہ رام چڑیا یاد آئی جس کی چونچ سے مچھلی پھسل کر لہروں میں چھپ سے غائب ہو گئی تھی۔ اُسے اپنی آنکھوں میں آنسو امڈتے ہوئے محسوس ہوئے — لیکن اُس نے انہیں روک دیا —

"پیسے تو آپ کے ہاتھ سے گر گئے"! اُس نے تن کر کہا۔

"ارے واہ! نہ دہی تو گرا دی اٹھنی — تم لوگ ہوتے ہی ذلیل ہو۔ جھوٹ تمہاری زبان کی نوک پر ہے — !

آدمی غرّایا

"ہاں ہاں! غلطی تمہاری ہے" ان کا کوئی قصور نہیں۔ انہوں نے اٹھنی اچھی طرح تھما دی تھی۔ — "

پانچوں نے بھی بھاگئی دار ی —

خورشی کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے نارز ننھے کے سینے میں گھونپ دیا ہو۔ اس کے چاروں طرف اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر اس نے بے خبری میں اپنا نارز اٹھایا اور آدمی کے سر کو نشانہ بنا کر اچھالا ——

——'تم لوگ ہوتے ہی ذلیل ہو——'

پھر ایک چیخ بلند ہوئی۔ ایک ناگہانی فضا میں اچھلی ایک دھچکا لگا —— اور خورشی کو دکھائی دیا کہ نارز آدمی کے سر میں گھس گیا تھا ——

'تم لوگ ہوتے ہی ذلیل ہو——'

اسے کہیں دور سے چپو کی شپ شپ سنائی دی۔ اس نے آنکھیں مل کے دیکھا شکارا کچھ دور لہروں کو چیرتا ہوا جا رہا تھا۔ شکارے میں آدمی بیٹھا اب سگریٹ پی رہا تھا۔ اور ہانجی کوئی کشمیری گیت گاتا ہوا چپو چلا رہا تھا۔ شکارے میں خورشی کی وہ تین مچھلیاں بھی پڑی تھیں۔

کچھ بھی نہیں ہوا تھا نہ نارز اچھالا تھا نہ چیخ بلند ہوئی تھی، نہ کسی کا سر دو حصوں میں بٹ گیا تھا —— صرف خورشی کے زخمی دل میں ایک اور زخم کا اضافہ ہوا تھا۔ اس نے دور تک شکارے کو جاتے ہوئے دیکھا دھندلی آنکھوں سے —— اور دل ہی دل میں کہا —— "بابو! قصور تمہارا بھی نہیں، صرف اس کا ہے جو منہ تک لایا ہوا نوالہ چھین کر ہی خوش ہوتا ہے۔ ننھے بچوں کی طرح تالیاں بجاتا تھا ——"

پھر اس نے ڈھیرے سے ننھے کو اٹھایا اور اپنے پھٹے ہوئے فرن سے چھاتی نکال کر اس کے منہ سے لگا دی اور چپو سنبھال کر اپنی ناؤ کو گھر کی جانب دھکیلنے لگی۔ ڈل میں دور دور تک، شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے ❀

محرر تحصیل کی داستان

(ابتدائیہ نوٹ)

حضرات!

آج سے تین برس پہلے میں نے یہ داستان قلم بند کی تو اپنے ایک دوست کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اسے ایک عالم و فاضل کو دکھایا تاکہ وہ اس داستان کا لب و لہجہ وغیرہ درست فرمائیں۔ عالم و فاضل نے اس ناچیز کو مشورہ دیا کہ داستان میں کوئی ہیجان نہیں۔ اس لئے اسے دوبارہ قلم بند کیا جائے چنانچہ میں نے اسے دوبارہ قلم بند کر کے موصوف کو دکھایا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں سماجی و اقتصادی پس منظر کا فقدان ہے۔ میں نے تیسری بار اسے لکھ کر پیش کیا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں مقامی رنگ نہیں ملتا اس طرح آج تک [illegible] یہ داستان چالیس بار لکھ چکا ہوں اب یہ آپ کے

بار پھر قلمبند کر رہا ہوں۔ میں نے اس میں عالم و فاضل موصوف کے فرمانے کے مطابق سب پہلو مدِ نظر رکھ کر ترمیم کی ہے۔ لیکن اب اسے موصوف کو دکھائے بغیر آپ حضرات کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ کیونکہ اگر میں اسے ان کے پاس لے جاؤں۔ تو ممکن ہے وہ پھر مجھے مشورہ دیں کہ میں اسے ایک بار اور قلم بند کروں۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ داستان کبھی آپ حضرات کی خدمت میں پیش نہ ہو سکے گی۔ امید واثق ہے کہ آپ اس کی خامیوں اور کمیوں کو جو عالم و فاضل موصوف کو نہ دکھا سکنے کی وجہ سے اس میں رہ گئی ہوں نظر انداز فرمائیں گے۔ فقط بھورام محرر تحصیل

(سماچالیس منظر)

حضرات!

میں بھورام ولد گوبند رام علاقہ سودیش پور کا رہنے والا ہوں۔ سودیش پور ایک چھوٹا سا علاقہ ہے جہاں کے لوگ زیادہ تر کھیتی باڑی کرتے ہیں اور مویشی پالتے ہیں۔ ایک بنک ہے۔ ایک دکاندار ہے۔ ایک بنیا اور ایک لوہار ہے۔ ایک درزی اور کمہار ہے۔ علاقہ سودیش پور کے لوگ تقریباً سب کے سب ان پڑھ ہیں۔ صرف ہمارا ایک گھرانہ ہے جس میں تعلیم کی روشنی آگئی ہے چنانچہ چار پشتوں سے ہمارے گھرانے کے مرد کلرکی کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ یہ ناچیز سودیش پور کا واحد آدمی ہے جس نے انٹرنس تک تعلیم حاصل کی ہے ... بھی تعلیم کے اکھاڑے ہیں۔ سودیش پور کے سب مکان تقریباً پختہ اینٹوں کے بنے ہوئے ہیں۔ چھتیں [illegible] ہیں جو [illegible] آگ [illegible] بستی

ہیں یہی وجہ ہے کہ علاقہ سودیش پور میں سال میں دو چار مرتبہ آگ لگ جاتی ہے سارے علاقہ میں ہمارا مکان مشہور ہے کیونکہ یہ واحد مکان ہے جو پکی اینٹوں کا بنا ہوا ہے ہمارے علاقہ سودیش پور میں ایک پختہ کنواں ہے جو سورگباشی لالہ دین دیال نے اپنے پہلے لڑکے کے پہلے جنم دن پر بنوایا تھا۔ اس کنویں پر سودیش پور کی لڑکیاں اور عورتیں پانی بھرنے آتی ہیں لیکن پیار اور محبت کی کوئی داستان جنم نہیں لیتی جیسا کہ عام طور پر دوسری جگہوں میں ہوتا ہے (اس ناچیز نے بہت سی کتابوں میں ایسی داستانیں پڑھی ہیں)

(اقتصادی پس منظر)

میرے انٹرنس پاس کرتے ہی میرے والد سورگ کی طرف سدھار گئے۔ وہ علاقے کی تحصیل میں چالیس روپے ماہوار پر محرر تھے ان کے سورگباش ہونے پر جناب تحصیل دار صاحب بہادر نے کمال نوازش سے مجھے ان کی جگہ دے دی لیکن چونکہ میں ناتجربہ کار اور خام تھا۔ اس لئے تنخواہ صرف بائیس روپے مقرر کی گئی۔ اب یہ تنخواہ بڑھ کر بانوے روپے ہوگئی ہے۔ بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ نوکری کرتے ہوئے ابھی مجھے چھ ہی مہینے ہوئے تھے کہ میری شادی پاس کے گاؤں کے نمبردار پنچی رام جی کی سپتری سیتا دیوی سے ہوگئی۔ اب ہماری شادی کو سترہ برس ہو گئے ہیں۔ اور میں چار لڑکوں کا باپ، اور میری دھرم پتنی تین لڑکیوں کی ماں بن گئی ہے۔ کل ملا کے ہمارے سات بچے ہو چکے ہیں۔ بھگوان کی مہربانی ہمیشہ شامل حال رہی ہے۔ نوکری کے آٹھویں برس میں تحصیل میں تبدیلیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کی بنا پر

مجھے شہر کی تحصیل میں بھیجدیا گیا۔ اور آج نو برس سے میں اسی جگہ تعینات ہوں چونکہ اپنے رودشیں پور میں چیزیں سستی ملتی تھیں اور مکان کا کرایہ بھی نہیں دینا پڑتا تھا۔ اور باپ کے زمانے کی ایک گائے بھی تھی۔ اور سبزی ترکاری پیدا کرنے کے لئے سرکان کے پیچھے زمین کا ایک ٹکڑا بھی تھا۔ اس سے تنگدستی کا سامنا کبھی نہ ہوا تھا لیکن شہر میں آکر تنگی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ مہینے کے آخری دنوں میں قریب قریب فاقوں تک نوبت آئی۔ مگر ناچیز اس خاندان کا چشم و چراغ ہے جہاں بچپن ہی سے قناعت کا سبق پڑھایا جاتا تھا۔ اس لئے میں نے بچپن سے سیکھے ہوئے اسی سبق پر عمل کیا اور ہماری حالت بہتر ہو گئی۔ اب بھگوان کی دیا سے دونوں وقت کھانا ملتا ہے اور فاقوں کی نوبت نہیں آتی۔ رہی دودھ اور لسی کی بات تو ان چیزوں کی عادت ہم نے ترک کر دی ہے۔ اس لئے کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ الغرض بھگوان کی دیا ہر وقت شامل حال رہی ہے۔

(سیاسی پس منظر)

ایک سرکاری ملازم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ سیاست کے ساتھ بلاواسطہ یا بالواسطہ کوئی تعلق نہ رکھے۔ اس لئے میں عالم و فاضل موصوف کے کہنے کے باوجود اس داستان کا سیاسی پس منظر لکھنے سے قاصر ہوں اور اس کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔

(داستان کی وجہ تسمیہ)

حضرات !!

اس داستان کو قلم بند کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جب سے اس داستان کا جنم ہوا۔ میرے دل میں ایک طرح کی گھٹن پیدا ہوگئی۔ دن کو تحصیل کے کاموں میں الجھا رہتا تھا۔ اس لئے خیال اس طرف کم جاتا تھا۔ لیکن رات کو یہ گھٹن شدت اختیار کر لیتی تھی۔ کئی مہینے اسی مرض میں مبتلا رہا۔ دھرم پتنی سے کہا لیکن اس نے بھی اس طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ آخر ایک رات جب اس گھٹن نے شدت اختیار کی۔ اور نیند بالکل اڑ گئی تو میں اٹھ کر یہ داستان قلمبند کرنے لگا۔ اور قلمبند کرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے سینے پر سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا ہے۔

نوٹ

اگر یہ داستان پڑھنے کے بعد آپ بھی اپنے دل پر بوجھ سا محسوس کریں تو یہ ناچیز آپ کو مشورہ دیتا ہے کہ آپ بھی اپنی داستان قلمبند کیجیے بوجھ بشرطیکہ اتر جائے گا۔ (لبھورام)

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ نوکری کے آٹھویں برس میں میرا تبادلہ شہر کی تحصیل میں کر دیا گیا۔ میں نے شہر کے ایک محلے میں سات روپے ماہوار پر مکان کا بندوبست کیا۔ شہر میں مکانوں کی قلت دیکھ کر ہم نے اسے غنیمت سمجھا اور اس میں رہنے لگے۔ مکان بہت خستہ تھا۔ اور اس کی چھت ٹپکتی تھی۔ اور اس میں دھوپ کا تو کیا ہوا کا گزر بھی مشکل سے ہوتا تھا۔ لیکن ہم نے اس طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ ہمارے ہمسایہ میں ایک اور محرر رہتا تھا۔ جو محکمہ آبپاشی

میں ملازم تھا۔ اُس کی ایک دھرم پتنی تھی۔ اور وہ تین لڑکوں اور تین لڑکیوں کے والدین بن چکے تھے (اب وہ ایک اور لڑکی کا اضافہ اپنے کنبے میں کر چکے ہیں) جیسی کہ عورتوں کی عادت ہے۔ میری دھرم پتنی اور محرر آبپاشی کے محرر کی دھرم پتنی بہت جلد ایک دوسری کے ساتھ گھل مل گئیں اور دونوں میں کچھ باہم لگاؤ ان کی دیا سے راضی خوشی رہے لیکن اس کے بعد جیسا کہ عورتوں کا دستور ہے میری دھرم پتنی اور محکمہ آب پاشی کے محرر کی دھرم پتنی کی آپس میں چخ چخ ہو گئی۔ اور نوبت جھگڑے تک آ پہنچی اُس دن جب میں تحصیل سے گھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری دھرم پتنی کونے میں منہ پھلائے بیٹھی ہے۔ میں نے پوچھا

"کیا ہو گیا؟ منہ پھلائے کیوں بیٹھی ہو؟"

وہ بھڑک اٹھی۔

"پوچھتے ہو کیا ہو گیا؟ جو نہ ہو جائے تھوڑا ہے!"

"آخر بات کیا ہے؟ کچھ میں بھی تو سُنوں!"

میں نے حیران ہو کر پوچھا تو کہنے لگی۔

"تم اب سُن کر کیا کرو گے۔ تم نے تو اُسی دن حاتم کی قبر پر لات ماری تھی جب مجھے لا کر اس مکان میں ڈال دیا تھا۔ میں پہلے دن ہی بھانپ گئی تھی۔ کہ یہ عورت نیچ ہے۔ تم یہاں ہوتے تو دیکھتے۔ کہ کس طرح بڑھ بڑھ کے باتیں کرتی ہے۔ جیسے کسی بیرسٹر کی ہی بیوی تو ہے۔ آخر سمجھتی کیا ہے؟ یہاں کوئی اُس کا دیا بیٹھا ہے۔ بڑی ہے تو اپنے گھر میں۔ میں بھی اپنے گھر کی رانی ہوں۔ ہاں

"لیکن بھلی مانس! تم دونوں کی تو آپس میں گاڑھی چھنتی تھی۔ اب کیا ہو گیا؟"
میں نے ہنستے اور حیران ہو کر پوچھا۔

"اس کے ہوتے سوتوں کو ہو گیا۔ مجھے کیوں ہوتا کچھ؟ میرے ساتھ بات چیت بند کرے گی۔ تو یہاں کس کی جوتی کو پرواہ ہے۔"

یہ کہہ کر میری دھرم پتنی رونے لگی۔ اور روتے روتے میری تسلی تشفی کرنے لگی۔ میں نے اپنے طور سے معاملہ کی جانچ کی تو پتہ لگا کہ ہمارے ہمسایہ کے ہاں کوئی مہمان آیا تھا جس کے واسطے چائے بنانے کے لئے محکمہ آبپاشی کے محرر کی دھرم پتنی میری دھرم پتنی سے تھوڑی سی چینی مانگنے آئی تھی۔ اور میری دھرم پتنی نے دینے سے انکار کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ ہمارے یہاں بھی ختم ہو گئی ہے۔ تو اس نے ازراہ تمسخر کہا تھا کہ تم لوگ بھی ہماری طرح کنگلے نکلے۔ بس پھر کیا تھا پہلے تھوڑی سی چق چق ہوئی۔ اس کے بعد جھگڑا ہو گیا۔ اور اس کے بعد قطع تعلق! بات معمولی تھی لیکن سنگین بن گئی۔ ان دونوں عورتوں نے تب سے کبھی ایک دوسری سے بات نہ کی۔ لیکن اپنی اپنی جگہ پر دونوں ایک دوسرے کو طعنے دیتی رہیں۔ کوستی رہیں۔ اور ایک دوسرے کی ذات میں کیڑے نکالنے لگیں۔ خیر! چونکہ عورتوں کا سبھاؤ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے اور محکمہ آبپاشی کے محرر نے اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ کوئی دو سال اسی حالت میں گزر گئے۔

ایک دن حسب معمول جب میں تحصیل کے کام سے فارغ ہو کر گھر آیا تو میری دھرم پتنی خلاف معمول میری چلم بھرنے لگی۔ چلم بھرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"یہ رادھا کا پتی کتنی تنخواہ پاتا ہے ؟"

"تیری ہی جتنی پاتا ہوگا۔"

میں نے جواب دیا

"تم نے کچھ سُنا، اُس نے ریڈیو خرید لیا ہے۔ رادھا آج دن بھر بجاتی رہی!"

"ہاں تو خرید لیا ہوگا۔ اِس میں کیا ہے ؟"

"ہم بھی ایک، خریدیں گے !"

"لیکن پیسے کہاں سے آئیں گے ؟" میں نے جواب دیا

"وہ کہاں سے لائے ؟" برجستہ جواب ملا

"میں کیا جانوں لائے ہوں گے کہیں سے !"

میرا اتنا ہی کہنا تھا کہ وہ بھڑک اٹھی

"تم تو جنم کے نکمے ہو۔ نوکری کرتے کرتے اتنے سال ہو گئے لیکن ایک ریڈیو تک نہ خرید سکے۔ کبھی مجھے ایک بالی تک لاکر نہ دی۔ بچے الگ پھٹے ہوئے کپڑے پہنے ہیں۔ آخر تم نوکری کرتے ہو یا گھاس کاٹتے ہو۔ ؟"

یہ کہہ کر میری دھرم پتنی رونے لگی۔ اپنے گاؤں میں کبھی ایسی نوبت نہ آئی تھی۔ اس لئے میں بہت پریشان ہوا۔ حقہ گڑگڑاتے ہوئے میں سوچنے لگا میری دھرم پتنی جو کچھ کہہ رہی ہے وہ ٹھیک ہے میں نے غور سے اپنی حالت کو ایکبار پھر دیکھا۔ بچوں کے پھٹے ہوئے کپڑے دیکھے۔ دھرم پتنی کی حالت زار دیکھی۔ اندر اپنے سترہ سال پرانے کوٹ کی تہیں ٹٹولیں۔ اپنی تنخواہ کا حساب لگاکر دیکھا۔ جس میں سے مہینہ بھر کے راشن، سبزی ترکاری، تیل وغیرہ پر خرچ کرکے

کل دو روپے بچتے تھے۔ نوین سے بھی عمرتا دو ہی روپے بچتے تھے۔ کیوں کہ سات روپے مکان کا کرایہ دینا پڑتا تھا۔ اور باقی دو روپے میں مٹی کا تیل بھنگن کی تنخواہ تمباکو اور ایسی ہی کتنی چیزیں آتی تھیں۔ آتی کیا تھیں بھگوان کی مہربانی شامل حال تھی۔

اُس روز سے ہمارے گھر میں روز نئے جھگڑوں نے جنم لینا شروع کیا کبھی دھرم پتنی کہتی کہ اُسے زکام ہو گیا ہے۔ چار چھ آنے کی دوا چاہئے۔ میں حسب معمول خالی جیب دکھاتا۔ تو وہ کہتی۔ رادھا نئی ساڑی لائی ہے۔ نہ کپڑے نہ کرتے آئے ہیں۔ اور تم چار آنے کی دوا کو ترساتے ہو۔ کبھی کہتی رکمنی (یعنی ہماری بڑی لڑکی) کا دوپٹہ تار تار ہو گیا ہے۔ میں اپنی معذوری جتاتا تو کہتی پھر جنم ہی کیوں دیا تھا اسے؟ رفتہ رفتہ ایسی باتوں نے مجھے نڈھال کر دیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ ضرور مجھ میں کوئی خرابی ہے جو محکمہ آبپاشی کے اس محرر میں نہیں ہے چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس معاملہ کی جانچ پڑتال کر کے ہی دم لوں گا۔ جب میں نے اس معاملہ کی جانچ کی تو پتہ چلا کہ میرا ہمسایہ یعنی محکمہ آبپاشی کا محرر بڑا خطرناک آدمی ہے۔ رشوت لیتا ہے جس سے ساری چیزیں آتی ہیں۔ توبہ! ہرے رام!

میں نے دھرم پتنی سے اس کا ذکر کیا تو بجائے اس کے کہ وہ میری طرح ہرے رام کہتی۔ اُس نے مجھے جھڑک دیا۔ عورت ہوتی ہی ناقص العقل ہے۔ کہنے لگی۔

"رشوت لیتا ہے تو کون سی برائی کرتا ہے۔ تم سے تو اتنا بھی نہیں ہو سکتا"

جب میں نے اپنی مجبوری ظاہر کی اور دھارمک پستکوں کا حوالہ دیا جن

میں رشوت لینا مہا پاپ قرار دیا گیا ہے تو میری دھرم پتنی نے مجھے اور بھی جھڑکا اور یہاں تک دھمکی دی کہ اگر میں رشوت لینا شروع نہ کروں گا۔ تو وہ سارے عدد بچے میرے حوالے کر کے دریا میں چھلانگ لگا کر اپنی دکھ بھری زندگی کا خاتمہ کر دے گی۔ بہت دیر تک بحث ہوتی رہی۔ آخر کار مجھے ہار ماننا پڑی۔ بلکہ وعدہ کرنا پڑا۔ کہ میں بھی باقاعدہ رشوت لینا شروع کر دوں گا۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ میں کل سے روز مندر میں دیپ جلانا بھی شروع کر دوں گا۔ تاکہ رشوت لینے کے گناہ کا بوجھ ساتھ ساتھ ہلکا ہوتا رہے۔

دوسرے دن جب میں تحصیل میں داخل ہوا۔ تو میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ آج ضرور کچھ نہ کچھ حاصل کر کے رہوں گا۔ بھگوان کا کرنا کیا ہوا۔ کہ ایک آدمی کسی سابقہ فیصلے کی نقل لینے میرے پاس آ گیا۔

"آپ کو نقل نہیں مل سکتی!"

میں نے اس کی درخواست پڑھ کر کہا۔

"کیوں نہیں مل سکتی؟" اس نے پوچھا۔

"اس لئے کہ میں آج مصروف ہوں۔ چند ضروری مثلیں تیار کرنی ہیں۔"

"مگر مجھے تو نقل آج ہی چاہئے۔ ورنہ معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔"

"میں مجبور ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ کیوں کہ رشوت لینے والے ہمیشہ ایسا ہی جواب دیتے ہیں۔

"مہربانی کرو۔ میرا بہت نقصان ہو جائے گا۔"

آدمی نے منت کی اور میں نے موقع غنیمت جانا اور کہا۔

" صرف ایک صورت میں ہو سکتا ہے !"

" کوئی صورت نکالیے۔ میں شکر گذار ہوں گا "

" آپ کو شکرانے کے طور پر پانچ روپے دینے ہوں گے "

یہ سُن کر وہ آدمی دو ایک منٹ میری طرف دیکھتا رہا۔ شاید میں اُسے ایک کہنہ مشق رشوت خور نظر نہیں آرہا تھا۔

" آپ نقل تیار کیجئے۔ میں روپے ابھی لاتا ہوں " اُس نے کہا اور میری جان میں جان آئی تھوڑی دیر کے بعد جب وہ آیا تو میں نے نقل تیار کر رکھی تھی۔ صرف تحصیلدار صاحب کے دستخط کرانے باقی تھے۔ اُس نے آکر پانچ روپے کا نوٹ میری جیب میں ڈال دیا۔ میں نے نوٹ نکال کر اندرونی جیب میں رکھا اور کاغذات لے کر تحصیلدار صاحب کے پاس چلا گیا تحصیلدار صاحب نے نقل پڑھ کر اس پر دستخط کر دیئے۔

میں نقل اُٹھا کر جانے ہی والا تھا کہ انہوں نے پوچھا

" لبھو رام! تم نقل تیار کرنے کے لئے آسامی سے کتنے پیسے لیتے ہو؟"

" کچھ بھی نہیں جناب ! یہ تو میرا کام ہی ہے !"

میں نے جواب دیا۔

" تمہاری جیب میں کتنے پیسے ہیں ؟"

انہوں نے دوسرا سوال کیا

" پانچ روپے جناب " میں نے جواب دیا

" کہاں ہیں وہ پانچ روپے ؟"

انہوں نے تیسرا سوال کیا۔

اور جواب میں میں نے اندر کی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کے دکھایا۔ انہوں نے نوٹ لے کر دیکھا اور پھر مجھے دکھاتے ہوئے پوچھا۔

" یہ کیا ہے ؟ "

میں نے دیکھا، اور کانپنے لگا۔ نوٹ کے ایک کونے پر تحصیلدار صاحب کے دستخط تھے۔ میری ٹانگیں جواب دینے لگیں۔ تحصیلدار صاحب نے اسی وقت اپنے ہیڈ کلرک کو بلوا کر میری معطلی کا حکم لکھوایا۔

جب میں نوکری سے معطل ہو کر گھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں میری دھرم پتنی ہنسی کا مجسمہ بنی بیٹھی ہے۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ لیکن میں خاموش رہا۔

" سُنا کچھ تم نے ؟ "

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

" رادھا کے پتی کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ آج مکان کی تلاشی بھی ہوئی تھی "

میں پھر بھی چپ رہا۔

" سُنا ہے سرکاری پیسے کا غبن کیا ہے۔ "

میں نے اس پر بھی کچھ نہ کہا۔

" تم بولتے کیوں نہیں ؟ "

میری دھرم پتنی نے حیرت سے پوچھا۔

"آج تیرے پتی کو بھی معطل کر دیا گیا ہے!" میں نے جل بھن کر کہا۔

"ہائے رام ہمارے دشمنوں کو کیوں معطل کیا گیا؟"

"رشوت لینے کے جرم میں!"

میں نے جواب دیا

میری دھرم پتنی پہلے تو چپ رہی۔ پھر اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی آنکھیں بھر آئیں پھر آنسوؤں کی دھاریں پھوٹ پڑیں

میری قسمت اسی دن پھوٹ گئی تھی۔ جب تم سے بیاہی گئی تھی۔ تم تو جنم کے نکمے ہو۔ تم سے تو رشوت لینا بھی نہیں آتا"

(اختتامیہ نوٹ)

حضرات!

معطلی کے ایک ماہ بعد مجھے تحصیلدار صاحب نے بحال کر دیا۔ جس دن میری بحالی کا حکم ہوا، اس دن ہیڈ کلرک نے مجھے اپنے پاس بلایا

"لبھو رام اب تم بحال کیے جاتے ہو۔ کیا میں امید کروں کہ تم آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں کروگے۔؟"

"جناب میں کان پکڑتا ہوں۔ زندگی میں پہلی بار غلطی سرزد ہوئی تھی آئندہ کبھی نہ ہوگی"

میں نے جواب دیا

"دیکھو لبھو رام ہم بھی غلطیاں کرتے ہیں۔ لیکن تمہاری طرح پکڑے نہیں جاتے

اُس نے چپکے سے کہا۔

"وہ تو میری بدقسمتی تھی جناب!"

"بدقسمتی نہیں تھی، تمہاری ناواقفیت تھی۔ تم اکیلے اکیلے ہی سارا مال ہڑپ کر جانا چاہتے تھے!"

اُس نے کہا۔

میری آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔

پھر ہیڈ کلرک نے میرے کان میں کچھ رموز پھونکے اور میری آنکھوں کی پتلیاں اور پھیل گئیں

(معاف کیجئے میں وہ رموز یہاں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔)

اس کے بعد میری تمام شکایتیں رفع ہو گئیں۔ آج کل جناب تحصیلدار صاحب بہادر مجھ پر بہت مہربان ہیں۔ کاغذات پر بغیر کچھ پوچھے دستخط کر دیتے ہیں۔ دو ہزار روپے رشوت کا حصہ تو لے ہی جاتا ہے۔ الغرض بھگوان کی دیا شامل حال ہے!

بقلم خود۔ لبھو رام محرر تحصیل

افسردہ گلاب

زینتا! تم جا کے سو جاؤ۔

رات بہت ہو گئی ہے۔ تم ہرے ہرے چیل کے تنے سے ٹیک لگائے سایوں میں مدغم سی ہو کر بیٹھی میری ہر حرکت کا چوری چھپے جائزہ لے رہی ہو۔ میں نہیں جانتا تمہارے ذہن میں اس وقت کون سے خیالات کے سائے تیر رہے ہیں اور تم نہیں جانتیں کہ میں موم بتی کے آنسوؤں کی روشنی میں کیا لکھ رہا ہوں؟

تم یہ ضرور جانتی ہو کہ میں دن بھر تمہارے بھیا کے ساتھ شطرنج کھیلتے کھیلتے بہت تھک سا گیا ہوں۔ تم یہ بھی جانتی ہو کہ پہلگام کی خنک ہوائیں جسم کے اندر گھس آتی ہیں اور آدمی کے بیمار ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اس لئے تم جا کے سو جاؤ۔

ادھر خیمے کے اندر سو گیا ہے۔ اور میں آج کی رات ستاروں کی اب

مدھم روشنی میں جلتی ہوئی موم بتی کے سامنے گزار دینا چاہتا ہوں۔

جاؤ! کل صبح تک اس کہانی کا جلتا ہوا حصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اور کل صبح تک میں بھی اپنے ذہن اور دل کا بوجھ ہلکا کر چکا ہوں گا۔ کل میں تم سے بہت دور جا چکا ہوں گا۔ اور تم حسب معمول کسی خوابوں کی شہزادی کی طرح ایک خوبصورت پونی پر بیٹھ کر اپنے حسین بال لہراتی چندن واڑی تک گھوم آنا۔ پھر روز کی طرح کئی دل پامال ہوں گے۔ کئی آہیں تمہارا راستہ کاٹیں گی۔ کئی نازک فقرے تمہارے کانوں سے ٹکرائیں گے۔ کئی ذہنوں میں جنت کا تصور آ جائے گا۔ لیکن تمہارے اپنے ذہن کی جنت ویران ویران ہوگی۔

میں ایسی ویران جنت کی حقیقت بیان کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں کیا کروں؟ تمہاری یہ دو آنکھیں آنسوؤں سے لبریز۔ نہ معلوم جذبوں سے جلتی ہوئی یہ دو آنکھیں مجھے برابر گھورے جا رہی ہیں۔ اور میں اپنے اندر سب کچھ جلتا ہوا سا محسوس کر رہا ہوں۔

اس وقت یادیں تازہ ہیں۔ زخم ہرے ہیں۔ کل تک یہ تازگی ماند پڑ جائے گی۔ کل تک ایک کہانی لکھی جا چکی ہوگی۔ کہی جا چکی ہوگی۔ سنی جا چکی ہوگی۔ دنیا کا ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے۔

اس لئے میری طرف یوں گھور گھور کے دیکھنا چھوڑ دو اور اپنے خیمے میں جا کر سو جاؤ ——— سو جاؤ!! ——— سو جاؤ!!! ———

پھلوں کے بوجھ سے جھکی جھکی، انگ انگ سے رس ٹپکاتی ـ روم روم میں ایسی خوشبو میں جھومتی، البیلی، لچکیلی ناشپاتی کی ڈال۔ یہ انیتا ہے۔

ایک ہفتہ پہلے میں اسی طرح اپنے خیمے کے باہر تاروں کی چھاؤں میں رات آنکھوں ہی آنکھوں میں گزارنے کا ارمان لئے بیٹھا تھا۔ لیکن اُس دن میرے سامنے کوئی موم بتی نہ تھی۔ صرف میرے دل میں محبت کا ایک شعلہ موجزن تھا۔ میرے انگ انگ میں پیار کا نشہ رقصاں تھا۔ اور پاس کے خیمے میں آہستہ آہستہ کوئی گا رہا تھا۔ اور ایک سُریلا نغمہ ہواؤں پر اُڑتا ہوا جانے کن جذبوں کی جھلک دکھا رہا تھا۔ گیت کے بول میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ لیکن آواز کا جادو ہی دل کی جھیل میں ہلچل مچانے کے لئے کافی تھا۔ رات چُپ چاپ گزر رہی تھی۔ اور میں صبح کا انتظار کر رہا تھا۔

اُس صبح کی بھی ایک دلکش کہانی ہے۔ میں اپنے خیمے کے باہر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اچانک چوڑیوں کی کھنک نے میرا قلم تھام لیا۔ اور میری نظریں کاغذ پر سے پھسلنے لگیں۔ اور پھسلتے پھسلتے نرم گھاس پر سے ہوتی ہوئی دو خوبصورت پاؤں پر جم گئیں۔

اور میں نے دیکھا

اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔

بالوں کا ایک آبشار تھا۔ کل کل کرتا ہوا۔

دو جھیل سی آنکھیں تھیں گہری گہری۔

دو پھول سے عارض تھے گلابی گلابی۔

دو ہونٹوں کی تحریریں تھیں سُرخ سُرخ۔

دو . . . .

رُک جاؤ!
میرے لیلے قلم رُک جاؤ۔ کہیں تحریر بے ہوش نہ ہو جائے۔

"یہ میری بہن ہے، انیتا!"
انل نے کہا۔

انل اور میں صبح ہی دوست بن گئے تھے۔ آدمی چند روز گزارنے کے لئے آیا ہو۔ کسی پہاڑی مقام پر، اور موسم دلکش ہو اور بہتے پانی کی موسیقی کانوں میں رس گھول رہی ہو۔ تو وہ اجنبی دوست بن ہی جاتے ہیں۔ تاکہ آدمی جی بھر کے قدرت کی صناعی کی داد دے سکے۔ مگر انل اور میں صرف اسی جذبے کے تحت دوست نہیں بنے تھے۔ شطرنج کے باہمی شوق نے ہمیں دوست بنایا تھا اور صبح ہم بازی لگائے ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ اور ہم مہروں کے کھیل میں اتنے محو ہو گئے تھے۔ کہ نہانا اور شیو کرنا تک بھول گئے تھے۔ یہاں تک کہ سورج چیل کی پھننگوں کے اوپر چڑھ آیا۔ اتنے میں انیتا چائے لے کر آگئی تھی۔

"یہ میری بہن ہے انیتا ـــــ اور یہ شہ ـــــ"
انل نے کہا

اور میں چائے کی خوبصورت پیالیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جن میں سے ہلکی ہلکی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ بھاپ کے ساتھ ساتھ میری نظریں اوپر اٹھنے لگیں۔

اور پھر اٹھ کر جھک گئیں اور مجھے یاد آیا کہ میرے بادشاہ کو شہہ لگی ہے میں
نے نظریں جھکائے ہی اپنا تک کے رانی کو سلام کیا۔
اور نمستے کا جواب چند نقرئی گھنٹیوں سے دیا۔
میرے اندر ـــــ بہت اندر ــــ چند دریچے وا ہوئے۔ دریچوں
کے اس اچانک کھلنے کو محبت تو نہیں کہتے ؛
آؤ! تمہیں گلے لگاؤں میری محبت کے پہلے گلاب!
میں نے شہہ بچائی۔
انل نے دوبارہ شہہ دی اور میرا فرزین مار لیا۔ شہہ بدستور قائم رہی
اور میں نے دیکھا کہ مجھے مات ہو گئی ہے

شام کو جب انل، تم اور میں لدر کے کنارے بیٹھے تھے۔ اور جب،
تم اپنے شانوں پر ساون کی گھٹائیں لہرائے مہاکوی کا گیت سنا رہی تھیں،
اُس وقت بھی میں اپنے دل میں کھلے ہوئے نوخیز گلاب کے بارے میں سوچ
رہا تھا۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ اپنے ہی دل میں کھلے ہوئے گلاب سے ڈر
لگ رہا تھا۔ کہتے ہیں آنے والے واقعات اپنا سایہ پہلے ہی ڈال دیتے
ہیں۔
پھر تم نے مجھے مہاکوی کے بنگالی گیت کا ترجمہ انگریزی میں سنایا تھا۔ لیکن
میں تمہاری آواز نہیں سن رہا تھا۔ تمہارا گیت نہیں سن رہا تھا میں صرف وہ موسیقی

سُن رہا تھا۔ جو تمہارے گلے میں تھی۔ دو جھیلوں کی گہرائیوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں گھٹاؤں کے بیچ وخم کو دیکھ رہا تھا۔ میں اُن خوشبوؤں کو سونگھ رہا تھا۔ جو میری نس نس میں بس رہی تھی۔ پھر نہ جانے تم نے میری آنکھوں میں کیا دیکھ لیا تھا نہ جانے میرے من میں کیا پڑھ لیا تھا۔ نہ جانے کس اجنبی حس نے تمہیں خبر دی تھی۔ اور تم یکا یک چپ ہو گئی تھیں۔

ہائے آدمی اپنے راز کو کس طرح عیاں کر دیتا ہے!

اُس کے بعد تمہاری ہر حرکت سے بے چینی کا اظہار ہونے لگا!

انیتا! تم سچ بتاؤ اُس دن تمہاری بے چینی کا سبب کیا تھا۔ اور جب انل نے وہ کہانی سُنائی تھی کہ کس طرح پرانے وقتوں میں بنگال کی کنواریاں اپنے کنوارپن کے زہر سے تنگ آ کر کسی براہمن کے گلے میں جے مالا ڈال کر اپنے آپ کو سہاگن تصور کرنے لگی تھیں۔ تو تم اٹھ کر وہاں سے چلی گئی تھیں۔ تمہارے چلے جانے کے بعد میں اپنا قرار کھو بیٹھا تھا۔ تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں نے اپنے اِس قرار کو کن نازک مرحلوں سے بچایا تھا۔ کیا اسی دن کے لئے بچایا تھا؟

تمہیں اپنے دل کے اندر ٹٹول کر اِس سوال کا جواب دینا ہوگا انیتا!

"انل! تم نے شادی کیوں نہیں کی ہے؟"

اُس دن چندن واڑی سے آتے ہوئے میں نے انل سے پوچھا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دیتا انیتا نے اپنی پونی قریب لا کر کہا۔

"اس لیے کہ میں نے ہنسی کی ہے۔"

"اور تم ــــ تم نے کیوں ہنسی کی ہے ؟"

"میں بتاتا ہوں، انیتا کو مردوں سے نفرت ہے۔"

نیل نے کہا۔

اور میں نے ایک زور کا قہقہہ مارا۔ مگر نیل اور انیتا کی نظروں نے میرے اس قہقہے کو میرے ہونٹوں پر منجمد کر دیا۔ ہم سب گھوڑوں سے نیچے اُتر آئے۔ اور ایک کل کل کرتے ہوئے جھرنے کے کنارے بیٹھ گئے۔ نہ جانے ہم سب کیوں یک ایک خاموش ہو گئے۔ تھکے ہم چپ چاپ جھرنے کے کنارے بیٹھے رہے لمحے بیت گئے۔ چند جاوداں لمحے اور اس کے بعد نیل نے کہا۔

"دادا! میں تمہیں ایک کہانی سناؤں گا۔"

"ہوں!"

ایک بنگالی نوجوان تھا۔ بے چارے کا باپ مر گیا تھا۔ اس کی ایک بہن تھی۔ جو تھرڈ ائیر میں پڑھتی تھی ــــ"

نیل نے کہنا شروع کیا

اور انیتا اُٹھ کے ٹہلنے لگی۔

ٹہلتے ٹہلتے دور نکل گئی۔

میں خاموش رہا۔

"بنگالی نوجوان ایک سرکاری دفتر میں کلرک تھا۔ ایک دن نوجوان

کی ماں نے اس سے کہا۔ اپنی بہن کے لیے کوئی شریف سا لڑکا تلاش کرو۔ کیوں کہ جوان لڑکی کی ماں تب تک انگاروں پہ لوٹتی ہے۔ جب تک اُس کی لڑکی کے ہاتھ پیلے نہ ہو جائیں۔ بھائی نے اپنی بہن کے لیے لڑکا تلاش کیا۔ لڑکا لائق، ایم، ایس سی تھا۔ اور شریف خاندان کا تھا۔ اور ایک سرکاری دفتر میں ایل، ڈی، سی تھا۔ بات چیت کا سلسلہ چل پڑا۔ ایک دن وہ لوگ لڑکی دیکھنے کے لیے آ گئے۔ تم سُن رہے ہو نا؟"

"ہُوں ــــ"

"بھائی نے بہن سے کہا، وہ چائے لے کر اندر آئے۔ تاکہ وہ لوگ اُسے دیکھ سکیں کیا کرتا رواج ہی ایسا تھا۔ اُس کی بہن چائے لیکر اندر آگئی۔ وہ بہت گھبرا رہی تھی۔ وہ چائے میز پر رکھ کر جانے لگی۔ تو دیکھنے والوں کے ساتھ آئی ہوئی ایک عورت نے کہا۔

"کہاں جارہی ہو بیٹی۔ تمہیں گانا وانا نہیں آتا؟ کچھ تو سُناؤ۔"

بہن نے بھائی کی طرف دیکھا۔

لیکن بھائی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ کیا کہتا بے چارہ۔ بہن دوسرے کمرے سے ستار لائی۔ اور اُنہیں گانا سُنایا۔ گانا سُنا کر وہ جانے لگی۔ تو اُسی عورت نے کہا۔ ٹھہر جاؤ بیٹی! ذرا اپنے بال کھول دو۔"

بہن نے بال کھول دیئے اور پھر جانے لگی۔

بھائی نے چوری چھپے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

"ادھر آؤ بیٹی! کیا نام ہے تمہارا ؟"
"کہاں تک پڑھا ہے تم نے ؟"
"مچھلی کا اچار ڈالنا جانتی ہو ؟"
"سفید کپڑوں کو ٹینوپال سے دھوتی ہو یا سرف سے ؟"
"طبلے پر تین تال بجا سکتی ہو ؟"
"ذرا کتھا کلی کے بھاؤ تو بتا دو ۔"

اور ان تمام سوالوں کے دوران بھائی سوچ رہا تھا کاش : وہ کسی لڑکی کا بھائی نہ ہوتا۔ تاکہ کوروؤں کے دربار میں دروپدی کا یہ چیر ہرن ہوتے نہ دیکھتا۔

انہیں ساری باتیں پسند آئیں لیکن جہیز کے نو ہزار کی سطح سے نیچے آنا پسند نہ آیا۔ بے چارہ کلرک بھائی کیا کرتا۔ صرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ رشتہ منظور نہیں ہوا۔ اور اس کے بعد انیتا دو مہینے تک بیمار رہی اور پھر ایک دفتر میں ایل ڈی سی ہو گئی۔

"اب اپنے بے ساختہ قہقہہ لگاؤ دادا!
لگاؤ قہقہہ ـــــ !!"

انیتا! تم نہیں جانتیں کہ جب تم ٹہل کر واپس آ گئیں تو میں اندر ہی اندر کن وادیوں سے گزر رہا تھا۔ تم میرے چہرے کا رنگ دیکھ کر حیران سی رہ گئی تھیں

تمہیں میرا سراپا دیکھ کر اچنبھا ہوا تھا۔ اور تمہاری آنکھوں میں ایک سوال ابھر آیا تھا

لیکن میری آنکھوں نے وہ سوال پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔

کیوں کہ دھند کے چند دبیز پردوں نے میری آنکھوں سے ہر سوال کو

چھپا دیا تھا۔

اور کل شام تم اسی سوال کا جواب لینے میرے پاس آئی تھیں۔

ہاں کل شام ہی کی تو بات ہے۔

میں اپنے تھیے کے باہر چیل کے درخت سے ٹیک لگائے نہ جانے

کن سوچوں میں ڈوب گیا تھا اور ستاروں کی مدھم روشنی میں اپنے دل کو ہتھیلی پر

نکال کے دیکھ رہا تھا۔ کہ تم چپ چاپ آ کے میرے سامنے بیٹھ گئی تھیں شاید

میری آنکھیں تم تھیں۔

شاید میں کچھ کچھ اداس بھی تھا۔

نہ جانے کسی کی محبت اداس کیوں کر دیتی ہے۔

تم نے بہت دیر چپ سادھ کر کہا تھا۔

"مجھ سے بہت محبت کرتے ہونا؟"

میں چونک اٹھا تھا۔ تم کیسے جان گئی تھیں، کہ میں تم سے بہت محبت کرتا

ہوں۔ تم نے کس طرح میرے دل کی گہرائیوں سے وہ موتی نکال لیا تھا؟

میں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

زبان سے کچھ نہیں کہا تھا۔

کیسے کہتا کہ مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے یہ محبت کا اظہار

اتنا شدید ہو گیا ہے کہ میں اسے زبان سے ادا ہی نہیں کر سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے زبان پر آبلہ پڑ جائے گا۔

"کیسی محبت ہے یہ تمہاری ؟"

تم نے سرگوشی میں پوچھا تھا۔

"بہت گہری —— بہت ہی گہری !" میں نے بھی سرگوشی ہی میں جواب دیا تھا۔

اور تم چند لمحوں کے لئے مسحور سی ہو گئی تھیں۔

لیکن صرف چند لمحوں کے لئے۔

اور اُس کے بعد تم نے کہا تھا

"لیکن مجھے تم سے نفرت ہے ! —— ہر مرد سے نفرت ہے !!"

انیتا ! تم ابھی تک سوئی نہیں ؟

میں جانتا ہوں تمہارے اندر کون سے طوفان اٹھ رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں اسی جگہ نیم تاریکی میں بیٹھ کر اپنے ارمانوں کی گرہیں کھول رہا تھا۔ تو تم دبے پاؤں میرے پاس آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ میں نے تمہاری طرف دیکھا اور ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

" اب بات بھی نہ کرو گے ؟ "

تم نے دھیرے سے کہا۔

میں پھر بھی چپ رہا۔

" اس نے تمہیں میری کہانی سنائی ہے۔ لیکن ادھوری۔ باقی حصہ سنو گے؟
میں نے یہ حصہ آج تک کسی سے نہیں کہا ہے۔"

میں نے پھر بھی کچھ نہ کہا۔

صرف ٹکر ٹکر تمہاری طرف دیکھتا رہا۔ اور پھر تم نے خود ہی کہنا شروع
کیا ——

" ایک دن جب میں باہر جا رہی تھی۔ یہ انہیں دنوں کی بات ہے وہ
لڑکا مجھے پھر ملا تھا۔ وہی جو مجھے شادی کے لئے دیکھنے آیا تھا۔ مجھے دیکھ
کر کہنے لگا، تم مجھے بہت پسند آئیں۔ اپنے بھائی سے کہہ دو کہیں سے
دس ہزار روپے ادھار لائے۔ مجھے غصہ آگیا میں نے تقریباً چیخ کر کہا،
تمہیں شرم نہیں آتی؟' وہ کہنے لگا' کیا کروں میری ماں مانتی ہی نہیں۔
کہتی ہے روپیہ بہت بڑی چیز ہے۔ میں مجبور ہوں، پھر نہ جانے کیا ہوا۔
وہاں کھڑے کھڑے ہی میری آنکھوں سے گنگا بہہ نکلی۔ مجھے کچھ نہ سوجھا
میں دوڑی دوڑی کالی کے مندر گئی۔ اور سوگند کھائی۔ کہ میں کبھی شادی نہیں کروں
گی۔ اور ہر مرد سے نفرت کروں گی!

اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟

تم بولتے کیوں نہیں۔ تمہاری یہ خموشی مجھے جلا کر راکھ کر دے گی۔"

میں کیا بولتا؟

بولنے کے لئے رہا ہی کیا تھا۔

میں نے دیکھا تمہاری آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے باہر چھلک پڑے اور پھر تم انہیں چھپاتی وہاں سے چلی آئیں۔

انیتا! تم جاکے سو جاؤ۔ تمہیں جل کر راکھ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم نے سوگند کھائی ہے۔ میں نے محبت کی ہے۔ میں شنکر کی طرح غم کا سارا زہر خود پی لوں گا۔

کل صبح تمہارے جاگنے سے پہلے ہی میں یہاں سے جا چکا ہوں گا دور ــــ بہت دور ــــ!!

اب تم جاکے سو جاؤ! ــــ سو جاؤ!! ــــ سو جاؤ!!!

پردہ نشین

یکایک بجلی کا کوندا ہوا۔ بادل زور سے گرج اٹھے اور ساتھ ہی بارش کی پھوار نے ٹین کی چھت پر جلترنگ بجانا شروع کردیا۔ زینب نے کتاب ہاتھ سے رکھ دی اور شیشے کی کھڑکی سے باہر برستی بارش کی رم جھم میں کھو گئی۔ اُف! جب گھنگھرو باندھے مینھ کی دیوی ناچنے لگتی ہے۔ تو ایسا کیوں لگتا ہے۔ جیسے دل کے کھنے زخم پر کسی نے انگلی رکھ دی ہو۔ مگر یہ سوچنا گناہ ہے۔

اُس نے دوبارہ کتاب اٹھائی اور بظاہر اُس کی سطروں میں محو ہو گئی۔ امتحان میں اب صرف بیس دن باقی رہ گئے ہیں۔ پر یہ بارش یوں لگتا ہے جیسے کوئی کسی کے کٹورے میں موتی رکھ کر کڑی ہلا رہا ہو۔ ہشت! یہ دماغ خواہ مخواہ بہک جاتا ہے۔ نورجہاں کی ماں کا نام بی بی عزیزن تھا۔ بی بی عزیزن۔ کس قدر عامیانہ نام ہے یہ بھی۔ سرور جہاں ہوتا یا کم از کم عشرت جہاں ہوتا۔ نورجہاں کی ماں کا نام تو

بس ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ کتنی محبت تھی سلیم کو اُس کے ساتھ۔ لوگ عجب ہی کہتے ہیں۔ کہ بادشاہوں کے دل نہیں ہوتا۔ تاج محل کو نہ دیکھئے۔ اتنا عظیم کارنامہ محبت کی ابدیت اور عظمت کا جیتا جاگتا ثبوت، ہے کوئی جو اس حقیقت کو جھٹلا سکے؛ نہیں نہیں، محبت گناہ ہے۔ کنواری لڑکی کو اِن معنوں میں سوچنے کی اجازت نہیں۔ آخر کیسے محبت ہوتی ہوگی لوگوں کو؟ بس کسی کو دیکھ لیا اور محبت ہوگئی۔ ہُنھ! بکواس ہے سب، کچھ سلیم جیسے اوباش اور شرابی شہزادے سے کوئی کیسے محبت کر سکتا ہے آوارہ مزاج تو پرلے درجے کا تھا وہ۔ اوہ یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ توبہ!

نورجہاں کا اصلی نام مہر النساء تھا۔ اور ــــــ مگر یہ بارش تو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ سوال دہرایا نہیں جا سکتا۔ اور ابھی وہ مسخرے کا باپ آتا ہوگا، کیسا بے ڈھنگا آدمی ہے وہ بھی۔ کبھی کپڑے پہننے کا سلیقہ نہیں آئے گا اُسے۔ جیسے خود نہیں پہنتا، کوئی زبردستی اُسے کپڑے پہنا دیتا ہے۔ ہونہہ ہونہہ! جیا نے اُس کی بیوی کیسی ہوگی۔ ابھی پچھلے ہی دنوں تو اُس نے کہا تھا کہ اُس کی شادی نہیں ہوئی ہے کنوارا رہے گا۔ عمر بھر کوئی لڑکی اُس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرے گی۔ ناک دیکھو بہت بڑی، جیسے کسی نے گرما گرم پکوڑا رکھ دیا ہو۔ سوں، سوں کرتا ہوا۔ سمجھ تو کبھی بیچارہ رکھتا ہی نہیں۔ خدا جانے پڑھا ہی نہ ہو۔

اللہ! یہ مجھے کیا ہو گیا ہے آج؟ اس ایک گھنٹہ میں دو سطریں بھی نہیں پڑھ سکی ہوں۔ دراصل اب میرا دماغ تھک گیا ہے۔ کوئی مذاق ہے۔ صبح سے شام تک پڑھتی رہتی ہوں۔ دماغ بہک نہ جائے تو کیا ہو۔ دماغ بہک جانا اور دماغ [illegible] ہیں کیا فرق ہے [illegible] بھول گئی ہوں [illegible] اتنی سی بات

بھی یاد نہیں رکھ سکتی۔ پہلی ہی بجرات کو بتا دیا تھا نا مسٹر نے۔ اور میرے جی میں آئی تھی۔ کہ کہہ دوں "پڑھاتے پڑھاتے آپ کا دماغ چل گیا ہے۔ ارے!! اگر میں سچ مچ کہہ دیتی تو؟ —— تو —— ؟

نورجہاں کی شادی شیر افگن سے کر دی گئی۔ شیر افگن یعنی شیر کو مارنے والا۔ جانے نورجہاں کو اُس کے ساتھ محبت تھی یا نہیں؛ شوہر جو تھا اُس کا۔ شوہر کے ساتھ محبت ہر ایک کو ہوتی ہوگی۔ خاک ہوتی ہے۔ نوارحمن کی اور نظیر چچا کی بک بک تو روز ہی گھر میں ہوتی ہے۔ نظیر چچا کہتے ہیں کہ میاں بیوی میں یہ آئے دن کی بک بک نہ ہو تو زندگی کا خاک مزہ آئے چھچھوری، یہ بھی کوئی زندگی ہوئی۔ کہ جو بیس گھنٹے بک بک کرتے رہو۔ تنگ نہ آجائے آدمی!"

امی تو اس سلسلہ میں بڑی خوش نصیب واقع ہوئی ہیں۔ کبھی ابا کے ساتھ جھگڑا نہیں کرتی ہیں۔ اور نہ وہ کرتے ہیں۔ امی کی مرضی تو نہیں تھی۔ مجھے سکول یا کالج بھیجنے کی ابا بہتیں ملتے، ضد کرنے لگے۔ مگر امی تھیں کہ مرغے کی وہی ایک ٹانگ۔ اللہ لڑکی کو کالج بھیجا ہے۔ شرم بھی کوئی چیز ہے۔ نا بابا کالج وغیرہ میں لڑکیاں بے پردہ ہو جاتی ہیں۔ خدا نہ کرے جو ہمارے گھرانے کی بیٹیاں بے پردہ ہو جائیں۔ غصہ ہی تو آگیا تھا ابا کو۔ لیکن پھر خود ہی امی کی بات مان لی۔ گو تم بہت برا کیا جو امی کی بات مان گئے۔ میں تو تنگ آگئی ہوں اس چار دیواری میں۔ جدھر دیکھو دیواریں۔ جدھر دیکھو چلمنیں۔ گویا قید خانہ ہو گیا۔ ابھی کل ہی ساجدہ کہہ رہی تھی۔ کہ اُن کے کالج میں بادام کے پیڑ پر شگوفے پھوٹ آئے ہیں۔ میرا تو جی مچل گیا تھا دیکھنے کو۔ پر توبہ کرو۔ اماں سنیں تو کھا ہی جائیں۔ میں

بھی جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہوں۔ ابھی ماسٹر آئے گا تو اُسے کیا سناؤں گی ؟ سب سے پہلے وہ مجھ سے تاریخ ہی کے سوال پوچھے گا۔ جانے وہ تاریخ کے سوال کیوں پوچھتا ہے۔ پوئٹری پڑھاتے پڑھاتے تو اُس کے کانوں کی لویں تک سُرخ ہو جاتی ہیں۔ خاص کر بائرن اور شیلی پڑھاتے وقت۔ ہائے اللہ! کس قدر شرما جاتا ہے۔ مجھے تو ہنسی روکنی مشکل ہو جاتی ہے۔ ترس آتا ہے بے چارے کی حالت پر۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے گلے میں پھندا ڈال دیا ہو۔ ہشت! بے چارہ وہ بھی تو کسی کی آنکھ کا نور ہو گا۔ کسی کے دل کا قرار ہو گا۔ اُونھ، کس قدر عامیانہ جملے۔ ایسے جملے تو اَن پڑھ اور گنوار لڑکیاں بھی کہتی ہوں گی۔ چلو اَن پڑھ اور گنوار لڑکیاں پھر بھی بہتر ہیں۔ گھر کی چار دیواری میں پڑے پڑے سڑ تو نہیں جایا کرتیں۔

یہ بارش بھی غضب کرتی ہے۔ جیسے بارش کے قطرے نہ ہوئے موسیقی کی لہریں ہوئیں۔ جیسے ٹین کی چھت، نہ ہوئی وائلن کے تار ہوئے۔ یہ وائلن بھی کیا خوب چیز ہے۔ ڈھنگ کا بجانے والا ہو تو آدمی جھوم ہی تو جاتا ہے۔ ہاں! بجانے والا ڈھنگ سے بجانا جانتا ہو۔ جیسے کسی فلم کا ہیرو، ایک محبت کرنے والا۔ جان کی قلابازیاں کھانے والا ہیرو۔ کتنا عامیانہ مذاق ہے ان لوگوں کا بھی! اے صاحب! وائلن بجاؤ تو کیا یہ ضروری ہے کہ کوئی لڑکی ضرور سُنے؟ اور اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوں۔ کتنا غلط تصور ہے۔ میرے دل کی دھڑکنیں تو تیز نہیں ہوتیں۔ جب میں ریڈیو پر وائلن سُنتی ہوں، دل کی دھڑکن تو اُس وقت تیز ہو جاتی ہے۔ جب بادل زور سے گرجتے ہیں۔

ہے نا عجیب سی بات! اس بات کو کیا کہتے ہیں۔ اُف! ماسٹر نے تو بتا دیا تھا۔ یہ بھول جانے کا مرض مجھ میں جڑ پکڑ گیا ہے۔ ہاں! سطحی مشاہدہ، وقتی سطحی مشاہدہ ہے یہ مشاہدہ یا مطالعہ؟ شاید مطالعہ ہو۔ خیر جانے دو۔ امتحان میں آنے کی چیز تو ہے نہیں جو آدمی دماغ پر زور ڈال کر یاد کرے۔

یہ ماسٹر بھی عجیب مخلوق ہے مجھے طوطے کی طرح ہر چیز رٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ لاکھ کہو کہ میرا دماغ سیاہی چوس نہیں، مگر کوئی مانے بھی۔ پر وہ بھی تو بھلائی ہی کے لئے کر رہا ہے۔ میں ہی تو آخر امتحان میں پاس ہو جاؤں گی۔ وہ تو نہیں ہو گا۔ یہ لوگ بھی کیسے بے غرض ہوتے ہیں۔ دوسروں کو پڑھاتے ہیں، دوسروں کو پاس کرانے میں اپنا سر کھپاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ پیسے لیتے ہیں۔ اب دنیا میں ہر ایک چیز پیسے سے ہی تو نہیں خریدی جا سکتی اس نگوڑی محبت کو ہی لیجئے۔ لوگ کہتے ہیں یہ ہو جاتی ہے، کی نہیں جاتی خریدی نہیں جاتی۔ بے وقوف جاہل!! ہو جاتی ہے۔ جیسے محبت نہ ہوئی نمونیہ کی بیماری ہو گئی!

جہانگیر کشمیر میں مر گیا تھا۔ لو! مر گیا جہانگیر بھی۔ کیا نام تھا اس کا۔ ہاں سلیم، سلیم کی بیوی تو انارکلی تھی۔ نہیں نہیں!! انارکلی تو ایک خادمہ تھی جس کو سلیم کے ساتھ محبت ہو گئی تھی۔ اب یہ بات کوئی کیسے مان لے کہ ایک خادمہ کو ایک شہزادے کے ساتھ محبت ہو جائے۔ پر اس کا کیا! ہو جاتی ہے یہ کم بخت۔ اور پھر درمیان میں ایاگو آجاتا ہے۔ نہیں نہیں!! دل میں آجاتا ہے جیسے کسی کے درمیان میں آجاتا ہے یہ، کوئی زبردستی تو نہیں گھسیٹ

لانا ہے اسے۔ جب کہ آخر میں مرنا بھی پڑتا ہے۔ بے چارے کو۔ سچ سچ!
اُس دن حمیدہ نے اُس فلم کی کہانی سُنائی تھی۔ کیا نام تھا اُس کا؟ جانے کیا تھا!
میں تو بھول ہی گئی۔ اُس میں بھی ولن آخر میں مرجاتا ہے۔ یہ ولن دراصل کڑ در
ہوتا ہوگا۔ سوکھا سوکھا سا، مریل، ہڈیوں کا پنجر۔ دھت تیرے کی! جیسے ولن
نہ ہوا بھاڑے کا ٹٹو ہو گیا۔

تو یہ میری! ابھی ماسٹر آئے گا اور میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں گی۔ مجھے تو نہ جانے
کبھی اُس سے نفرت ہے۔ کتنا بدصورت آدمی ہے۔ جانے ابا اسے کہاں
سے ڈھونڈھ لائے۔ مگر اُسے کیا معلوم تھا کہ مجھے اُس سے نفرت ہو جائے
گی۔ ہاں مجھے اُس سے نفرت ہو گئی ہے۔ اُس کے کپڑوں سے اُس کی
باتوں سے۔ اُس کے اُٹھنے بیٹھنے کے طریقوں سے۔ اور چائے پیتا
ہے تو منھ سے ایسی آواز نکالتا ہے۔ جیسے سیٹی بجا رہا ہو۔ یہ نفرت کا جذبہ
بہت شدید ہوتا ہے۔ اگر میرے سامنے کوئی اس کے بید لگائے
تو میں آنکھ بھی نہ جھپکوں۔

مگر کوئی کیوں بید لگائے اس کے؟ ہر ایک اس سے نفرت
نہیں کرتا ہوگا۔ ایک میں ہوں جو اس سے نفرت کرتی ہوں۔ نفرت محبت
تو نہیں جو ہر ایک آدمی سے کی جاتی ہے۔ ہاں! کیا میں صرف اسی سے نفرت
کرتی ہوں؟ باقی بھی تو ہیں، ابا ہیں امی ہیں۔ بو ارحمن ہیں، نظیر چچا ہیں یوسف
بھائی ہیں۔ اب کتنے نام گنواؤں، پر ان کے ساتھ تو میں نفرت نہیں کرتی
نفرت اسی ماسٹر کے ساتھ کرتی ہوں

کیا واقعی نفرت کرتی ہوں ؟؟

چلو جانے دو۔ بڑی جان ہے یہ دورہ کبھی کبھی مجھ پر۔ بس سوچنے لگی تھی ہوں
تو سوچے ہی چلی جاتی ہوں۔ ادھر ادھر کی باتیں۔ ابھی اس دن تو آئینے کے ساتھ
بھی باتیں کر ڈالیں۔ حمیدہ کہہ رہی تھی۔ کہ میں بہت خوبصورت ہوں۔ میرا جسم متناسب
ہے۔ اور، اور ایسے شرم کی باتیں ہیں یہ سب ! وہ تو بڑی بے شرم ہو گئی ہے
کہہ رہی تھی کہ مجھے اچانک کوئی بے خبری میں دیکھے تو فلیٹ ہو جائے میری
جوتی سے فلیٹ ہو جائے۔ مجھے کیا؟ اس دن تو میں نے دیر تک آئینے
کے ساتھ باتیں کی تھیں اور سوچتی رہی تھی اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے میری کینڈول
پر میٹھا میٹھا ساز بج رہا ہو۔ جیسے میرے سارے بدن کو دھیمی دھیمی آنچ لگ رہی
ہو جیسے میرا گوشت اچھل رہا ہو۔ جیسے میرے گالوں پر آگ سی دہک رہی ہو
اُف اب مجھے کتنا پسینہ آگیا تھا۔ میری قمیص تک بھیگ گئی تھی۔ میں تو ڈر ہی گئی تھی اُس
دن کہ کوئی روگ ہی نہ ہو۔ عجب مجھے گماں لگ گیا ہو۔ میں نے سوچا تھا۔ میں صبح
سویرے ہی امی سے یہ سب کہہ دوں گی۔ اور میں واقعی کہہ بھی دیتی۔ اگر صبح ہی صبح
وہ حمیدہ کی بچی نہ آجاتی اور میں اُس کو یہ سب باتیں نہ سنا دیتی۔ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ
ہو گئی تھی۔ وہ یہ سب سن کر۔ توبہ! کتنی گندی لڑکی ہے وہ بھی۔ کہنے لگی تھی کہ مجھے فوراً
امی سے کہہ دینا چاہیے۔ کہ میری شادی کر دیجئے۔ نگوڑی بے شرم! واقعی کالجوں
میں جا کر یہ لڑکیاں شرم بھول جاتی ہیں۔ شرم و حیا ہی تو ہم لڑکیوں کا فطری زیور ہے
اُف میرے اللہ! اب بھی بالکل وہی کیفیت ہے۔ یہ ہلکی ہلکی آنچ
تو مجھے جلا کر راکھ کر دے گی۔۔ یہ دبا دبا درد تو میری ہڈیاں چوس کر دم لے گا۔ یہ میٹھا

میٹھا ساز تو میری شریانوں کا خون نچوڑ لے گا۔ جی چاہتا ہے کہ اٹھ کر سارے کپڑے اُتار دوں۔ اور بارش میں کھڑی ہو جاؤں۔ یا دریا کے پانی میں کود پڑوں یا ٹین کی چھت سے لپٹ جاؤں۔ اتنی بارش ہو رہی ہے۔ لیکن پھر بھی اتنا حبس ہے جیسے آگ برس رہی ہو۔ تاج محل کے مقبرے میں بھی حبس ہوگا۔ سلیم کے دل میں بھی حبس ہوگا۔ انارکلی کا دل بھی جل رہا ہوگا۔ نہیں، اس کا دل نہیں جل سکتا۔ وہ تو بجھ گیا تھا۔ اسی دن جب اسے دیوار میں چنوایا گیا تھا۔ نور جہاں کی ماں کا نام بی بی عزیزن تھا۔ نہیں امیر جہاں تھا۔ شاید عشرت جہاں ہو۔ مگر، یہ بچوں میں بکھڑا پن کیوں آگیا ہے؟ یہ ٹانگوں اور بازوؤں میں اینٹھن کیوں ہو رہی ہے؟

جی چاہتا ہے کوئی اٹھا کر مجھے اس کھڑکی سے باہر پھینک دے تاکہ نیچے میری ہڈیاں پسلیاں ایک ہو جائیں۔ شیر افگن کو قتل کرانے میں جہانگیر کا ہاتھ تھا۔ جھوٹ! نہیں یہ سچ ہے۔ پر انارکلی؟ وہ تو اس کی بیوی تھی!! ہشت!! اس کی بیوی نور جہاں تھی۔ نور جہاں! جو مقبرے میں قید ہے کتنا حبس ہے چلا دو یہ مقبرہ۔ گرا دو۔ مجھے اس کھڑکی سے۔ توڑ ڈالو میری ہڈی پسلی پھینک دو مجھے جہل کی گہرائیوں میں۔ مگر یہاں کون آئے گا۔ ان چلمنوں کے اس پار!

کون آئے گا؟

ابا تو نہیں آئیں گے۔

بھیا بھی نہیں آئیں گے۔

نظیر چچا بھی نہیں آئیں گے۔

پر ماسٹر ابھی آئے گا۔ ماسٹر جی! میں آج نہیں پڑھوں گی۔ میرا جی نہیں چاہتا پڑھنے کو۔ بس آج آپ مجھے اُٹھا کر اس کھڑکی سے باہر پھینک دیجئے۔ اٹھائیے نا، میں آپ کی منت کرتی ہوں۔ میں آپ سے لپٹ جاؤں گی۔ اگر آپ نہیں مانیں گے تو۔

اُف! ——— میں جل رہی ہوں۔ ———

اُٹھائیے مجھے!

اس کھڑکی سے باہر پھینک دیجئے۔

ہاں! ——— ایسے!! ———

اب میں ہواؤں سے گزر رہی ہوں۔ ابھی ایک لمحے میں ایک دھماکا ہوگا۔ تارے ٹوٹ پڑیں گے۔ کائنات بکھر جائے گی اور میری ہڈی پسلیاں چور چور ہو جائیں گی۔

پھر سکون ہوگا ———

ٹھنڈک ———

مقبرے کی نمی!!

کھٹ ——— کھٹ ——— کھٹاک ———!!!

دروازے کے دونوں پٹ کھول کر، ماسٹر نے اپنی برساتی اُتار کر اندر نظر دوڑائی ——— اندرا اُس کی شاگرد تکیے کو گود میں لئے بے سُدھ سو رہی تھی ———

اور باہر بارش بدستور ٹین کی چھت پر جل ترنگ بجا رہی تھی۔

غیر حاضر

بے شرم! دیدے پھاڑ پھاڑ کے اس طرح دیکھتا ہے جیسے آنکھوں
ہی سے کھا جائے گا۔ بے چاری کو بنجر گھاٹ، نشی کیا ہوا یوسف شاہ چک ہو گیا

توبہ!

تیس پچاس کے ملازم کیا مل جاتے ہیں۔ کہ طبیعت جھٹ عشق کرنے پر تل
جاتی ہے۔ زیدہ دلیری تو دیکھو، یہ بھی نہیں سوچا کم بخت، کہ اتنے آدمی دیکھ رہے
ہیں۔ اور یہ دھوبن کی بچی! اس سے بھی شاید اب جوانی سنبھالی نہیں جاتی۔ نگوڑی
جوانی کیا آتی ہے۔ ان چھوکریوں پر کہ پر پرزے نکل آتے ہیں۔ بھگوان
جانے کیا ہو گیا ہے زمانے کو۔ نہ شرافت، نہ حیا، نہ جھجک۔ نہ جانے
کہاں چلی گئی ہے۔ ہائے وہ زمانہ یاد آتا ہے جب یہاں کی عورتیں گھر کی
چہار دیواری سے باہر قدم بھی نہ نکالتی تھیں۔ اب تو وہ باتیں خواب ہو گئی ہیں

فیشن کی دنیا ، وہ ساری شرافت اور جھجک اور شرم و حیا سے اُڑ رہی ہے وہ وقت ہی نہ رہا جب ہمارے ہاں کی عورتیں اپنے آنگنوں میں شالی کوٹتی تھیں چٹائیاں بنتی تھیں ۔ چرخا کاتتی تھیں ۔ اور شام کو دیئے کی روشنی میں بچوں کو رستم پہلوان کی کہانیاں سناتی تھیں ۔ اور خدا کی عبادت کیا کرتی تھیں ۔ نہ جانے یہ دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا ۔ کسابے کی جگہ رومال نے لے لی ۔ فرن کی جگہ ساڑی آگئی مکھن کی بجائے سر پر سرسوں کا تیل لگایا جانے لگا ۔ اس حد تک تو ٹھیک تھا لیکن سرسوں کے تیل کی جگہ اب اناپ شناپ قسم کے تیلوں نے لے لی ہے جو طرح طرح کی خوشبوؤں سے معطر ہوتے ہیں ۔ اور تو اور اب لڑکیاں بالوں کو ترشوانے بھی لگی ہیں ۔ ابھی کشیپ رشی کی اس سرزمین کو نہ جانے کیا کیا دیکھنا ہے ۔

ہٹاؤ میں بھی خدا جانے کیا باتیں لے بیٹھا ہوں ۔ میرے راشن ٹکٹ کا نمبر ہی نہیں آتا صبح سویرے ہی تو نمبر پر لگا دیا تھا ۔ یہ گھاٹ منشی کا بچہ بہت آہستہ آہستہ کام کرتا ہے ۔ یہ نہیں سوچتا کہ پبلک کو تکلیف ہوتی ہے پبلک کی پروا آجکل کون کرتا ہے ۔ پہلا گھاٹ منشی تو میری طرح چھٹ پٹ کام کرتا تھا ۔ میری طرح سے پرانے وقتوں کا آدمی تھا ۔ چپ چاپ اپنے رجسٹر پر آنکھیں جمائے کام کرتا تھا ۔ یہ سب نئے لونڈے تو بس مجنوں کے کان کترتے لگتے ہیں ۔ اب کوئی ان سے کیسے کہے کہ میاں صاحبزادے تمہارا کام کسی دھوبن کی بچی کی پنڈلیاں دیکھنا نہیں ہے ۔ راشن ٹکٹوں پر پبلک کو راشن دینا ہے ۔

لیکن یہ بھی کیا کرے بے چارہ ! سامنے دیکھنے کی چیز ہو اور دیکھنے والے کے پاس آنکھیں ہوں تو بے ارادہ اُٹھ ہی جایا کرتی ہیں نظریں ۔ قصور تو اس دھوبن کی بچی کا ہے ۔ شلوار گھٹنوں سے اوپر چڑھالی ہے ۔ نزن سے اوپر لہنگا سا باندھ لیا ہے ، جس سے جسم کے حسین خطوط اور زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں یہ ننگی پنڈلیاں تو ، توبہ توبہ ! یہ بھی نہیں دیکھتی کہ گھاٹ پر کتنے غیر مرد بیٹھے ہیں کپڑے ہی دھونے تھے تو بارہ بجے کے بعد آ کر دھوتی ۔ جب راشن کی سیل بند ہو جاتی ہے ۔ اور جب گھاٹ ہمیشہ سُونا جاتا ہے ۔

بے حیا ہو گئی ہیں یہ عورتیں ۔ کچھ پروا نہیں کرتی ہیں ایسی باتوں کی ۔ آخر مردوں کو کیوں مورد الزام ٹھہراتے پھریں ؟ اور تو اور میں خود دفتر جاتے یا آتے وقت ، اپنی گلی کے موڑ پر نان بائی کی دوکان کے سامنے رک سا جاتا ہوں ۔ غیر ارادی طور پر نگاہیں دکان پر بیٹھی ہوئی نان بائی کی بیوی کی طرف ، اُٹھ ہی جاتی ہیں ۔ بے شرم ! سر کے تیچھلے حصہ تک اوڑھنی کھسکا کر اس طرح بیٹھتی ہے ۔ کہ دیکھتے ہی دل میں کسک پیدا ہو جاتی ہے ۔ کم بخت خود تو اندر تنور کے پاس پڑا رہتا ہے اور بیوی کو دوکان پر بٹھائے رکھتا ہے ۔ قسمت سے بیوی بھی خوبصورت پائی ہے ۔ کہ اُسے دوکان کا اشتہار بنا کے رکھ دیا ہے ۔ کوئی تعجب نہیں جو اُس کی دوکان پر گاہکوں کی اتنی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے ۔ آج کل عورت ایک اشتہار ہو کر رہ گئی ہے میں ٹھہرا اگلے وقتوں کا آدمی ۔ پھر نیا خون تو نیا خون ہے ۔ کیسے جوش نہ مارے ؟

اخ ——— اخ ——— اخ ———

"لسہ میر ولد رسّل میر۔ پانچ نفر!"

"حاضر جناب!"

"کیا لینا ہے بھئی!"

"شالی اور چاول"

"آٹا نہیں؟"

"نہیں جناب!"

لسہ میر کی باری آگئی۔ شکر ہے۔ میرا تو اس کے بعد دسواں نمبر ہے۔ جب تک سگریٹ ہی کیوں نہ سلگا لوں۔ گھاٹ منشی بھی تو سگریٹ پینے لگا ہے۔ دھواں دیکھو کس انداز سے بکھیرتا ہے کسی فلمی ہیرو کی نقل کر رہا ہو گا۔ ان فلموں نے تو رہی سہی کسر پوری کر دی ہے۔ اب تو دس سال کے بچے بھی سگریٹ پینے لگے ہیں۔ میں پچیس سال کی عمر تک سگریٹ کا نام سننے سے کانپتا تھا۔ بزرگوں کا لحاظ ہوتا تھا۔ آج کل تو بزرگوں کی کوئی پرواہ ہی نہیں کرتا۔ کتنے بزرگ یہاں بیٹھے ہیں۔ محال ہے کہ گھاٹ منشی سگریٹ پینے کی ہمت کرتا۔ پرانے وقتوں میں اتنی بے حیائی کہاں تھی؟ اب اس دھوبن کی بچی ہی کو لیجئے۔ مان لیا کہ نگاہ اٹھا کر کسی طرف نہیں دیکھتی ہے۔ صرف گھاٹ کے پتھر کو دیکھتی ہے جس پہ کپڑے پٹکے جاتے ہیں۔ واقعی نظریں تو نیچی ہی رکھی ہیں بے چاری نے۔ آخر کیسے دیکھے ادھر ادھر اتنے لوگ بیٹھے ہیں۔ لیکن یہ گھاٹ منشی کا ہوتا سوتا لگاتار اس کی طرف دیکھے جاتا ہے۔ توبہ! ان لوگوں کو شرم بھی نہیں آتی۔ ایسا ہی عاشق مزاج تھا تو کسی بھیڑ

ویٹر میں چلا جاتا ان تھیٹروں کی بھی الگ ہی بات ہوا کرتی تھی۔ اب تو تھیٹر سے مر
کھپ گئے ہیں۔ ٹاکیوں نے گرد اڑا دی ہے۔ اُن کی بھی۔ کتنا شوق ہوا
کرتا تھا۔ لوگوں کو تھیٹر دیکھنے کا۔ خود بھی کئی بار چھپتے چھپاتے گیا ہوں۔
خاص کر جن دنوں شہر میں جان کا تھیٹر آیا ہوا تھا۔ وہ جس شہر میں تھی لگاتی تھی تو تماشا
کے تاشے جگمگا اٹھتے جاتے تھے۔ ناچتی تھی تو معلوم ہوتا تھا آس پاس کی ساری
چیزیں ناچنے لگی ہیں۔ کیسا چہکا تھا وہ بھی۔ ایک دن جب پاس کوئی پیسہ نہ تھا۔
تو چپکے سے تپائی کے دراز سے ساڑھے تین آنے چرا لئے اور پھر اس زمانے
کے ساڑھے تین آنے آج کل تو تیس روپے بھی کچھ نہیں ہوتے۔ ہائے
کیا زمانہ تھا، ایک پیسے میں اول نمبر کے تین تین سگریٹ ملتے تھے یہی حال
اور چیزوں کا بھی تھا۔ تنخواہیں بھی کتنی ہوا کرتی تھیں۔ اُن دنوں، چودہ روپے
تو سپرنٹنڈنٹ لیتا تھا۔ لیکن ان ہی چودہ روپوں میں برکت تھی۔ آج کل تو چپڑاسی
بھی ساٹھ کے قریب تنخواہ لیتا ہے اور مہینے میں دس دن فاقے کرتا ہے
وہ برکت ہی اٹھ گئی ہے۔ آخر کیسے نہ اٹھتی۔ دن بہ دن بے حیائی اور بے
شرمی پھیل رہی ہے۔ زمانہ خراب نہ آگیا ہوتا تو کیا یہ گھاٹ منشی کا بچہ بے حیائی
سے گھور گھور کے اس بے چاری دھوبن کو تنگ کرتا۔ نہ ہوا میں جوان نہیں تو
مزہ چکھا دیتا بچے کو۔ چھٹی کا دودھ یاد نہ دلا دیتا تو وا... پہ نام نہ ہوتا۔ یہ جوانی
کتنی جلد بیت جاتی ہے ایک طرح کا نشہ ہوتی ہے یہ جوانی بھی۔ کتنا جوش خروش
کتنی سرمستی، جوانی کے دنوں میں کسی بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ ہائے،
وہ پوشیدہ کبھی یاد آتی ہے، اب تو خیر میری طرح بوڑھی ہو گئی ہے۔ سر کے بال

سفید ہو گئے ہیں۔ جھریوں نے حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ لیکن جوانی کے دنوں میں دیکھنے
کی چیز تھی۔ میں بھی بہت شریر تھا اُن دنوں قہ ــــــ قہ ــــــ قہ ــــــ
ایک دن شام کے وقت گوالوں کے ہاں دودھ لینے گئی تھی اتفاق سے
میں بھی وہاں دودھ لینے گیا تھا۔ پر شیریں کو دیکھا تو دودھ لینا بھول گیا اور
جب وہ دودھ لے کر جانے لگی۔ تو گلی کے اندھیرے میں اُس کے کولھے پر
ایک چٹکی لی۔ وہ اوئی کہہ کر تلملائی اور میں بھاگ گیا۔ مگر خیال ہے کہ اس واقعہ
کا ذکر کسی سے کیا ہو۔ نہ اُس نے کیا اور نہ میں نے کیا۔ اُن دنوں شرم و حیا
ہوا کرتی تھی۔ اور آج کل بے حیائی ہے۔

لوگ بھیڑ میں شیریں جان کو دیکھتے تھے۔ تو دل ہی دل میں آہیں
بھرتے تھے۔ مگر مجال ہے جو زبان سے ایک لفظ بھی کہا جاتا ہو۔ میں نے
خود شیریں جان کے لئے کتنی ہی راتوں کو آنسو بہائے ہیں۔ مگر کسی کو کانوں
کان خبر تک نہ ہوئی۔

شیریں جان کی تو بات ہی اور تھی۔ ناچتی تھی تو گھٹنوں تک ٹانگیں ننگی
ہو جاتی تھیں۔ یہ دھوبن کی بچی۔ اس کی ٹانگیں بھی بالکل ویسی ہی ہیں۔ دو منٹ
لگاتار دیکھو تو پسینہ پھوٹ آتا ہے۔ نہ جانے یہ گھاٹ منشی کس طرح دیکھے
ہی جاتا ہے۔ اور مر نہیں جاتا۔ میں جوان ہوتا تو نہ جانے کیا کرتا۔ جان پر
کھیل جاتا۔ پرانے وقتوں کے جوان ایسے کہاں ہوتے تھے۔ پیار اور محبت
کی خاطر جان پر کھیل جاتے تھے۔ وہ جوانی کے دن صرف ایک بار
لوٹ آتے صرف ایکبار!

جب عمر کی گردش تیز ہو جاتی ہے تو یہ کانوں میں شائیں شائیں کا شور کیوں ہونے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے اندر کہیں بہت سارے آبشار ایک ساتھ گرنے لگے ہوں۔ یہ، یہ تو جوانی کی علامتیں ہیں۔

"اری اپنی ٹانگیں ڈھک لے۔ دیکھتی نہیں یہاں اتنے سارے جوان مرد بیٹھے ہیں ــــ!"

"اونہہ جوان مرد بیٹھے ہیں تو کیا ہوا، کوئی کھا جائیں گے؟"

"ہاں ہاں کھا ہی جائیں گے اور کیا کریں گے۔ بے شرم کہیں کی!"

"میں کیوں بے شرم ہونے لگی۔ بے شرم ہوگی تیری میّا!"

مجھے بہت غصّہ آنے لگا ہے!

اور جب مجھے غصّہ آجاتا ہے تو غضب ہو جاتا ہے۔ ذرّے ذرّے پر تھرتھری طاری ہو جاتی ہے۔ اور پھر جوان مرد کا غصّہ! ہاں وہ پتھر ملنے لگا ہے وہ گھاٹ منشی کا رجسٹر سرک کر دریا میں گر گیا ہے وہ کشتی الٹ کر پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہہ گئی ہے۔ وہ دھوبن؟

ارے ابھی تو یہاں تھی ــــ شاید پیر پھسل گیا ہوگا۔

یہ دائرے؟ اُف، یہ پھیلنے لگے ہیں مگر نہیں یہ تو دھوبن کے بال ہیں جو کھل کر چناروں کی طرف پھیلنے لگے ہیں ــــ لہرانے لگے ہیں ــــ یہ آگ بجھاؤ، اس آگ کو! نہیں، یہ تو آنکھیں ہیں، سرخ آنکھیں، سرخ بھی کہاں، بھوری آنکھیں! مت دیکھو میری طرف۔

"داسد یوکول ولد ہری چند کول۔ سات نمبر!"

مت دیکھو میری طرف۔ ارے! یہ چنار کی شاخیں۔ ہہ ہہ یہ گرنے

والی ہیں۔ ہٹ تیرے کی! یہ تو ٹانگیں ہیں۔ کس کی ٹانگیں؟

شیریں جان۔ واہ وا، ابھی تک جوان ہو جانِ من!

"نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری —"

شوخی کی قسم کیا آواز پائی ہے۔ لچک لچک کر گاتی ہو۔ نہیں، لہک لہک کر گاتی ہو۔ نہیں چہک چہک کر گاتی ہو۔

"واسدیو کول: اندھیری چند کول۔ سات نفر"

"تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں —" ارے جیو میری جان، جُگ جُگ جیو۔ اٹھکھیلیاں؛ یہ تو شیریں جان نہیں ہے۔ یہ اُس کے کپڑے کیا ہوئے؟ اب تو یہ بالکل ہی ننگی ہو گئی ہے۔ ٹھہر تیں آیا۔ ہٹو راستے سے، جگہ چھوڑو۔ یہ دائرے پھر اُبھر آئے ہیں۔ رکو انہیں۔ مت رکو انہیں، یہ دھوبن کے بال ہیں۔

بوڑھا کھوسٹ — ہو ہو ہو!

کھوسٹ تیرا باپ — قہ قہ قہ!

لو میں آیا —

شو شنکر: تم تو بالکل ننگی ہو۔ یہ پانی بہت سرد ہے۔ نہیں پسینہ ہے۔ نہیں نہیں پانی ہے۔ پھر ڈوب جاؤ۔ آؤ دونوں ڈوب جائیں۔ یہ نیلا پانی ہے سرد سرد اور فرحت انگیز۔ یہ مچھلیاں، ہاں ہاں چھوٹی چھوٹی ڈوبتی ابھرتی ہوئی! — اب ٹمٹماہٹ بھی نہیں اندھیرا ہے۔ چراغ جلاؤ — مت جلاؤ چراغ — میں تھک گیا ہوں۔ تھکن، غنودگی، موت! ہم تم

’’نہ — مجھے! سونے دو — مجھے!!

’’ دیاسندیہ کول ولد ہری چند کول، سات نفر ا رے سے ‘‘

’’گھاٹ منشی نے چیخ کر آخری بار کہا اور دور کہیں سے آواز آئی۔

’’ غیر حاضر ——!‘‘

گرداب

۲

دو دن سے برف لگاتار گر رہی ہے۔

اور دو دن سے درگا مجھے لگاتار یاد آ رہی ہے۔

برف جب گرتی ہے تو کوئی شور نہیں ہوتا۔ کوئی آواز نہیں ہوتی۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر کوئی جل ترنگ نہیں بجتی ہے۔ برف تو بس چپ چاپ گرتی ہے اس جوان بیوہ کے آنسوؤں کی طرح جو اپنے نیم تاریک اور سرد کمرے میں اکیلی بیٹھی اپنے کمسن بیٹے کا سوگ منا رہی ہو۔ یا جیسے مٹی کے دیئے کی ٹمٹماتی روشنی میں کسی غریب کلرک کا لڑکا الجبرا کے سوال حل کر رہا ہو۔

درگا کی یاد بھی بس اسی طرح آتی ہے۔ کوئی دھڑکن تیز نہیں ہوتی۔ کوئی ہچکی فضا میں نہیں بکھر جاتی۔ کوئی ہنسی ہونٹوں کے دامن چاک نہیں کرتی یہ یاد چپکے سے آ کر دل کے شیش محل میں دھند کی طرح چھا جاتی ہے اور پھر یہ

سارا شیش محل بیمار چاندنی میں ڈوبا ہوا کوئی بھیانک طلسم بن جاتا ہے۔

دو دن سے برف لگاتار گر رہی ہے۔ اور ایسے میں جی چاہتا ہے کہ آپ کو تسامیؔن کاٹیج " کے اُس ڈرائنگ روم کی کہانی سناؤں جہاں کی ہر چیز، کھڑکیوں کے ریشمی پردوں سے لے کر فرش پر بچھے ہوئے دبیز کشمیری قالین تک ہلکے گلابی رنگ کی ہے یہاں تک کہ تپائی پر رکھے ہوئے پیرا کاشن کے تیل لیمپ کے تار بھی۔ اور جہاں کی نیم گرم فضاؤں میں نائٹ ۶۹ " کی کیفنا آ در مہک ہر دم پھیلی رہتی ہے۔

جب برف لگاتار گر رہی ہو اور ناٹ ۶۹ " کی مہک اور فرانسیسی عطر کی خوشبو ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر گرم ہواؤں میں گھوم رہی ہوں اور کوئی لڑکی اطالوی حسینوں کی طرح خوبصورت ہو، اور پیانو پر " مورے جوبنا کا دیکھو بہار" بجا رہی ہو۔ اور کوئی شریر لڑکا پانچ سو پچپن کے سگریٹوں کا دھواں بکھیر رہا ہو۔ تو دوزخ کا ڈر اور جنت کی ہوس سب ہی کچھ بھول جایا کرتا ہے۔ بس! دوزخ کے اسی ڈر اور جنت کی اسی ہوس کی کہانی میں آپ کو سنانا چاہتا تھا۔ پر یہ کمبخت درگا کی یاد دھند کی طرح سارے ذہن پر چھا گئی ہے۔ اور اس دھند نے تمام چیزوں کے چہرے بگاڑ کے رکھ دیئے ہیں۔

اُس دن حاجی اسمٰعیل جو کنز ایکٹر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، کہ اِن مفلس اور قلاش لوگوں کی باتیں ذہن کو گندہ کر دیتی ہیں۔ ایک گندی مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے۔

درگا اگر ایک ایسی لڑکی ہوتی جو جھروکے سے چھپ چھپا کر دیکھتی ہوتی۔ اپنے محبوب کو اشارے کرتی ہے تو مجھے اس کی یاد کبھی اتنا بے چین نہیں کرتی اگر وہ ایک ایسی لڑکی ہوتی جو ٹوٹی پھوٹی زبان میں پریم پتر لکھتی ہے۔ اور پھر لکھ کر پھاڑ دیتی ہے۔ تب بھی مجھے کوئی احساس نہ ہوتا۔ اگر وہ کوئی ایسی لڑکی ہوتی جو برہ کے گیت گاتے گاتے کھڑکی کی سِل پر ٹھوڑی رکھے رکھے سو جاتی ہے۔ تب بھی مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔

لیکن درگا ایک عجیب لڑکی تھی۔

وہ نہ آہیں بھرتی تھی۔ نہ پریم پتر لکھتی تھی۔ اور نہ کبھی گھر کے باہر پاؤں ہی رکھتی تھی وہ میرے ہی محلے میں رہتی تھی۔ اور میں نے کبھی اُسے چھپ چھپا کر دریچے کی اوٹ سے کسی نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے نہیں پایا ہے۔ وہ کبھی گھر کا کام کاج کرتے وقت گنگنایا نہیں کرتی تھی۔ اُس کے ہونٹوں کے پٹ کبھی کسی مسکراہٹ کے بوجھ سے وا نہیں ہوئے تھے وہ جوانی کی حدود کبھی کی، دیر ہوئی پھلانگ گئی تھی۔ اُس کے سارے سراپا میں کوئی دلکشی نہیں تھی۔ اُس کے بال ہمیشہ اُلجھے اُلجھے اور بے ترتیب رہتے تھے۔ اس نے کبھی دنداسہ کے چھلکوں سے اپنے ہونٹ لال نہیں کیے تھے اُس نے کبھی اپنی فراخ پیشانی پر بندیا نہیں لگائی تھی عجیب، جذبات سے عاری اور متین سی لڑکی تھی وہ۔

میں تقریباً روز اُسے میونسپلٹی کے نل پر دیکھتا تھا جب کہ وہ پانی سے

بھرا ہوا گھڑا اٹھانے کی جدوجہد میں مصروف ہوتی تھی۔ اُس کے سنجیدہ چہرے سے اُس کے دکھی ہونے کا احساس ہوتا تھا اور نہ سُکھی ہی ہونے کا۔ وہ صرف ایک چہرہ تھا۔ جیسے کسی آرٹسٹ نے کاغذ کے تختے پر چند ٹیڑھی سیدھی لکیریں کھینچی ہوں۔ اور اُن لکیروں میں جان ڈالنے سے پہلے ہی مر گیا ہو۔ اُس کا باپ شریدر جو کسی مقامی دفتر میں چپڑاسی تھا۔ اس لئے اُس کے گھر میں زندگی کبھی خوشحالی کی دھوپ نہ دیکھ سکی تھی۔ اس نے کبھی اسکول کا منہ نہ دیکھا تھا۔ کبھی کسی سہیلی سے کوئی راز کی بات نہ کہی تھی۔ اُس کی کوئی سہیلی تھی بھی تو نہیں۔ شاید اُس نے اپنے بچپن میں کبھی گڑیوں کا بیاہ نہیں رچایا تھا۔ وہ تو بس ایک کتاب تھی۔ بند کتاب۔ جس کی جلد کھردری تھی اور جس کی حالت بہت گندی تھی اس لئے آج تک کسی نے اس کتاب کے ورق الٹ کر اسے پڑھنے اور اس کا مفہوم سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

صرف ایک بار میں نے اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چند بوندیں لرزتی ہوئی دیکھی تھیں۔ یہ چار سال پہلے کی بات ہے۔ جاڑوں کا موسم تھا برف گھٹنوں گھٹنوں تک گر آئی تھی اور پھر یہ برف جم گئی تھی۔ اس لئے احتیاط سے قدم دھر کر چلنے والا آدمی بھی کبھی نہ کبھی پھسل ہی جاتا تھا۔ اور آس پاس کھڑے لوگوں کی بھرپور ہنسی کا مرکز بن جاتا تھا۔

وہ میونسپلٹی کے نل کے پاس پانی سے بھری ہوئی مٹکی کو کندھے پر جما رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے ایک قدم بڑھایا۔ پھر دوسرا قدم اٹھایا۔ اور جب تیسرا قدم بڑھانے لگی تو دھڑام سے نیچے گر گئی۔ کم بخت

پھسلن ہی ایسی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اُسے سنبھالا دینا چاہا۔ لیکن اُس سے پہلے ہی وہ کچھ دور تک جا کر گر گئی۔ اور پھر افسردہ نگاہوں سے مٹکی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھنے لگی۔

"چوٹ تو نہیں لگی تیرے؟"

میں نے پوچھا۔

"نہیں میرے کوئی چوٹ نہیں لگی۔" اُس نے نظریں نیچے کئے ہوئے ہی جواب دیا لیکن اُس کی نگاہ ہی مجھ کو بتا رہی تھی۔ کہ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے کچھ دیر پہلے مٹکی پانی سے بھری ہوئی تھی۔

"چوٹ تو لگی ہی ہو گی۔ تب ہی تو تمہاری آنکھوں میں آنسو ہیں۔"

"نہیں۔ کہہ جو دیا کہ چوٹ نہیں لگی میرے!"

اُس نے تڑپ کر جواب دیا۔ اور ٹوٹی ہوئی مٹکی کے ٹکڑوں کو جمع کرنے لگی۔ اور ایسا کرتے ہوئے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کچھ بڑبڑا رہی ہے۔

ٹوٹ گئی مٹکی تو کون۔ غضب ہو گیا۔ چار آنے نہیں تو زیادہ سے زیادہ چھ آنے میں نئی آ جائے گی۔ میں نے سوچا اور میں چل دیا۔ چوٹ تو اُس کے واقعی لگی ہو گی۔ لیکن یہ مٹکی ٹوٹ جانے کی چوٹ غالباً زیادہ شدید تھی۔ کیونکہ جب مٹکی ٹوٹ جاتی ہے۔ تو چھ آنے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ اور بیالیس روپے

تنخواہ پانے والے ملازم کے لیے سچ مچ آنے بڑی بات ہوتی ہے۔ لیکن یہ خیال مجھے اس وقت کہیں آیا۔ جانے کیوں؟

اُن دنوں میں سوچتا تھا۔ کہ شریدھر کو اب دُرگا کی شادی کرنی چاہیئے۔ کیونکہ درگا جوانی کے تپتے ریگستان میں بہت آگے بڑھ آئی تھی۔ یہ بات شاید شریدھر جو بھی جانتا تھا۔ کیوں کہ کئی بار میں نے اُسے محلے کے چند بزرگ آدمیوں کے ساتھ بات چیت کرتے سُنا تھا۔ اور پھر اِس سلسلے میں پرہت بھی ہفتے میں ایک دو بار اُس کے گھر کے چکر لگا دیتا تھا۔ ہاں درگا کی شادی ضرور ہونی چاہیئے۔ میں چاہتا تھا کہ دُرگا کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ دیکھوں جو بیاہتا لڑکیوں کے ہونٹوں پر شادی کے بعد کچھ دن کے لیے میکے آنے پر ناچتی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ دُرگا کو تب دیکھوں جب اُس کے بال سنورے ہوئے ہوں جب اُس کی فراخ پیشانی پر کم کم کی بندیا چمک رہی ہو۔ جب اُس کے ہونٹ دنداسے کے چھلکوں سے لال ہوں جب اُس کی آنکھوں میں کاجل کی گہری لکیریں ہوں۔ واقعی دُرگا اُس وقت حسین لگتی۔ نہ جانے میں کیوں اُسے حسین دیکھنا چاہتا تھا۔ انسانی فطرت بہت وسیع ہے مگر میں نے کبھی درگا کو حسین نہیں دیکھا۔ اب بھی جب یاد۔ مجھے یاد آتی ہے تو اُس کا وہ متین چہرہ اور جذبات سے عاری آنکھیں ہی میرے ذہن کے دریچے سے جھانکتی ہیں۔ یہ پارسال کے جاڑے کی بات ہے۔ کچھ دنوں سے برف لگاتار گر رہی تھی۔ اور شریدھر کو مجبوراً اپنے افسر کے ساتھ دورے پر جانا پڑا تھا۔ اُس نے افسر کی بہت منت سماجت کی تھی۔ کہ اسے دورے پر جانے کے لیے مجبور

نہ کیا جائے۔ کیوں کہ جاڑا ظالم شے ہے لیکن افسر بھی مجبور تھا۔ دورے میں اُس کا کھانا کون پکاتا؟ منھ ہاتھ دھونے کے لیے پانی کون گرم کرتا دن بھر کی تھکاوٹ کے بعد شام کو پاؤں کون دباتا۔ اس لیے افسر کی مجبوری کے پیشِ نظر شریدھ رچیہ کو اپنی مجبوری نظر انداز کرنا پڑی تھی۔ اور وہ دورے پر گیا ہوا تھا۔

ایک رات جب کہ میں سونے کی تیاری کر رہا تھا، ایک آتش فشاں پھٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے میں مبہوت رہ گیا۔ اور پھر رونے چیخنے اور شور مچانے کی آوازیں میرے کانوں کے پردوں کے ساتھ ٹکرانے لگیں۔

آتش فشاں نہیں پھٹا تھا بلکہ شریدھ رچیہ کے پرانے، شکستہ، بوسیدہ مکان کی چھت اچانک گر پڑی تھی محلے میں ایک کہرام مچ گیا۔ شریدھ رچیہ کی بیوی شوبھاوتی اپنے بال نوچنے لگی ننھے بچے رونے چلانے لگے۔ اور درگا؟ وہ ایک کونے میں اس بلی کی طرح سہمی سہمی بیٹھی تھی جس نے ابھی ابھی کسی بھیانک کتے کا غراتا ہوا چہرہ دیکھ لیا ہو۔ ایک چھوٹی سی ننگی تو جا سکے پر رو دینے والی لڑکی درگا اپنے مکان کی چھت گر جانے پر ٹکر ٹکر لوگوں کی طرف دیکھتی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہیں تھا۔ عجیب لڑکی تھی وہ۔

○

دوسرے دن سویرے میں پھر شریدھ رچیہ کے مکان پر گیا۔ اور اس کی بیوی کو سمجھانے لگا۔ کہ اس وقت ان کا اس مکان میں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ ٹوٹی ہوئی چھت کا سارا ملبہ پڑا ہے۔ ہو سکتا ہے دوسری منزل کی

شہتیریں بھی ٹوٹ جائیں

"پھر کیا کریں؟ وہ یہاں ہوتے تو ——"

شوبھاوتی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دیپ مالائیں دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔

اور اس پریشانی کے عالم میں میرے منہ سے جھٹ نکل گیا۔

"آپ لوگ ہمارے مکان میں آجائیے۔ وہاں کافی جگہ ہے۔"

"نہیں ماں! پتاجی جب تک نہ آئیں گے ہم کیسے جا سکتے ہیں؟"

دور کونے میں کھڑی ہوئی نرگا نے کہا۔

میں نے ایکبار گہری نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ حسب معمول کسی طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ ہائے! یہ جھوٹی تمکنت! یہ لوگ اگر چار دن کے بھوکے ہوتے ہیں۔ تو باہر کسی کو اس بات کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ کتنی ظالم تمنائیں ہوتی ہیں جو اِن لوگوں کے دروازوں کے پیچھے فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہیں۔ کتنی ناکام آرزوں کی لاشیں اِن لوگوں کے دل میں پڑی پڑی سڑتی ہیں۔ اور آنگن کا منھ نہیں دیکھتیں۔ درگا نے جو اپنے ارد گرد ٹاٹ کی دیواریں کھڑی کی تھیں۔ وہ ہمارے مکان میں آنے سے کیسے کھڑی رہتیں؟ اُس کی مفلس جوانی کے سارے گھاؤ جنھیں اُس نے اب تک چھپائے رکھا تھا۔ اب کیسے چھپ سکتے تھے؟

مجھے غصہ آگیا ——

"عجیب لڑکی ہو تم۔ اپنی معمولی ضد کے لئے تم چار عبادوں کا کچھ بھی خیال نہیں کرتیں؟"

اُس نے میری طرف ایک تیزابی نگاہ پھینک دی۔ اور جھٹ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اسی دن وہ لوگ ہمارے ہاں چلے آئے اور پھر تیرہ مہینوں تک ہمارے مکان میں رہے۔

ان تیرہ مہینوں میں درگا نے کبھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ ان تیرہ مہینوں میں، میں نے کبھی درگا کے ماتھے پر شکن نہیں دیکھی کبھی اُس کے ہونٹوں پر ہنسی کے سائے تھرتھراتے نہیں دیکھے۔ اور میں ایک بار پھر شدت سے چاہنے لگا کہ درگا کی شادی ہو جائے۔

لیکن درگا کی شادی نہیں ہوئی۔

ان تیرہ مہینوں میں شریدھر جُو نے پیسے جمع کرنے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کئے۔ میں تقریباً روز درگا کو اپنے اور اپنے بھائیوں کے پھٹے ہوئے کپڑے رفو کرتے دیکھتا تھا۔ شریدھر جو کو تو خیر دفتر سے وردی مل ہی جاتی تھی۔ لیکن اُس کی وردی سے شوبھاوتی کا پھٹا ہوا فرن تو ٹھیک نہیں ہو سکتا تھا۔ درگا کی تار تار شلوار تو رفو نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ چیزیں تو روپیہ پیسہ خرچ کرنے کے بعد ہی آتی ہیں پر بیالیس روپے میں آدمی کتنا خرچ کر سکتا ہے۔ اور مکان کی ٹوٹی ہوئی چھت مرمت کرنے کے لئے بچت کتنی کر سکتا ہے؟ شاید شریدھر جو پہلے کے اس سوال کا جواب بتانے یا شاید درگا بتا دے جو ایک ایک وقت کھانا کھانے کے باعث ہڈیوں کا پنجر بن گئی تھی۔

تقریباً روز ہی شریدرجو اپنے ٹوٹے ہوئے مکان کو دیکھنے جاتا تھا۔ اور پھر دل ہی دل میں بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا کرتا رہتا تھا۔ اگر سوجی ہوئی آنکھیں یہ ظاہر کرتی ہیں۔ کہ وہ روتا رہتا تھا۔ تو اُس کی آنکھیں بہت سوجی ہوئی تھیں۔ ایک دن اُس کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔

"شریدرجو! کیوں بچے بنتے ہو۔ تمہارے آنسوؤں سے شہتیر تو نہیں بن سکتے۔ جن سے تمہارے مکان کی چھت ٹھیک ہو گی۔ ہمت سے کام لو!"

"تو کیا آپ سمجھتے ہیں، میں نے آج تک ہمت سے کام نہیں لیا؟ ہمت ہی کے سہارے تو زندہ ہوں۔ پر ہمت بھی جواب دیدے تو آدمی کیا کرے؟"

"ہاں، کیا کرے!"

شریدرجو کے مکان کی چھت ٹھیک نہیں ہو سکی۔ کیونکہ جب تیرہ مہینے کے بعد اُس کے تبادلے کا حکم آیا تو اُس نے اپنی جمع کی ہوئی پونجی کو گن کے دیکھا کُل ایک سو اکیس روپے اور باسٹھ نئے پیسے تھے۔ اس میں اکیسو روپے نفیسہ کی پونجی تھی۔ اور اکیس روپے باسٹھ نئے پیسے اِن تیرہ مہینوں کی فاقہ کشی کی پیداوار! جاتے ہوئے اُس نے مجھ سے رخصت چاہی اور گلوگیر آواز میں کہا۔

"مکان کی مرمت بھی نہیں ہو سکی۔ درگا کی شادی بھی نہیں ہو گی۔ اب کچھ نہیں ہو گا۔ کچھ نہیں ہو گا!"

میں نے ... ہمت بار در گا سے کہنا چاہا تھا۔ — سُن درگا! تیری

شادی نہیں ہو سکتی۔ تیرے باپ کے مکان کی چھت ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ
تیرے باپ کی تنخواہ کل بیالیس روپے ہے جو وہ سرکار کے خزانے سے
وصول کرتا ہے اس لیے اُٹھ اور اُٹھ کے بال سنوار۔ آنکھوں میں کاجل کی لکیریں
کھینچ۔ ماتھے پر کُم کُم کی بندیا سجا اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ کی دھوپ پھیلا لے
سیٹھ جیون شاہ کے مندر کی دیوداسی بن جا۔ اور بھگوان کی خوبصورت مورتی
کے سامنے جسے جیون شاہ نے گیارہ ہزار روپے میں خریدا ہے۔ ناچتے
ناچتے بے دم ہو جا۔ ممکن ہے کبھی کسی پجاری کی نظر تمہارے جسم پر پڑے اور
تمہیں آکاش پرے جانے والا رتھ ملے اور وہ تمہیں اُس رتھ پر سوار کر کے
اندرلوک کی سیر کرا لائے۔ خبردار! جو نہاں رنڈی صورت ناچی یا پریم کے گیت
گائے۔ کیونکہ اُس صورت میں تمہیں مندر سے دُھتکار کر نکال دیا جائے گا۔ اور
کوئی موٹی توند والا مہنت لمبا سا جنیو پہنے، اور ماتھے پر چندن کا ٹیکہ لگائے
اپنی بھدی آواز میں کہے گا۔

"نکال دو اِسے۔ سارا مندر اپوتر کر دیا کلموہی نے"!

اور اُس وقت بھگوان تمہاری کوئی سہائتا نہیں کریں گے۔ کیونکہ بھگوان
کا سارا کاروبار مہنت ہی کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔

مگر ——

مگر میں کچھ بھی نہ سکا۔

کیونکہ شرمیلا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شبو بھابی کی آنکھیں نمناک
تھیں بچوں کی نگاہیں نیچی تھیں۔ پر دُرگا کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہیں

جھلملا رہا تھا۔

لمحے بیت گئے ——

دن بیت گئے ——

اور رفتہ رفتہ میں بھولنے لگا کہ کوئی درگا تھی جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایسی باتوں پر جو دل پر یا جیب پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتیں، آنسو بہاتی تھی۔ اور بڑی بڑی باتوں پر، ایسی باتوں پر جن کا حل سوچتے سوچتے دماغ چکرا جائے اور کچھ نہ بن پڑے، خاموش ٹکٹکی لگا کر دیکھتی رہتی تھی۔ کوئی درگا تھی جس میں کوئی دلکشی نہ تھی۔ اس کے سوا کہ وہ جوان تھی۔ کوئی درگا تھی جو عام لڑکیوں سے ہٹ کر، اپنی ایک الگ دنیا کی مالک تھی۔ میں بھول گیا۔

شریدر جو کے جانے کے کوئی ایک سال بعد، میں ایک دن کولگام کسی کام کے لئے گیا۔ شریدر جو تحصیلدار کے کمرے کے باہر زور زور سے آواز دے رہا تھا۔

"مسماۃ زونی وغیرہ —— زونی وغیرہ ——"

میں نے اُسے پہچانا نہیں۔ بہت کمزور سا معلوم ہو رہا تھا۔ اور بوڑھا بھی لیکن اس نے مجھے جھٹ پہچان لیا۔

"ارے آپ یہاں کیسے ؟ گھر میں سب خیریت تو ہے ؟ بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی"

اُس نے ایک ہی سانس میں کہا۔

"ارے شریدر جو تم ؟ !" میں اُس کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر پسیج گیا وہ اپنے ٹوٹے ہوئے مکان کو ابھی تک نہیں بھولا تھا جسے اُس نے میرے بھروسے پر چھوڑ دیا تھا

"وہ میرا مکان ابھی ہے یا گر گیا سب ؟ کا سب ؟ فرصت ہی نہیں ملتی ورنہ دیکھنے ضرور چلا آتا۔"

"ابھی تک تو ٹھیک ہے شریدر جو ! تم سناؤ۔ بال بچے کیسے ہیں، درگا کی بات کہیں پکی ہو گئی ؟"

مجھے درگا بھی اب سے یاد آ گئی۔ نہ جانے ذہن کے کس حصے پر چھپ کر بیٹھی تھی۔ شریدر جو کے سارے بدن میں ایک مردنی کی لہر دوڑ گئی۔ اُس نے عجیب نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر چونکا دینے والی ہلکی آواز سے کہا۔

"جب مکان کی چھت کی مرمت نہیں ہو سکی۔ تو اُس کا بیاہ کیسے ہوتا ؟"

"چھت کی مرمت تو خیر ہوتی رہے گی جب تک درگا کی بات تو کہیں پکی کر دیتے ۔"

"ایسا کیا چھپاؤں بھیا ! اصل میں درگا کی شادی جبھی ہو سکتی تھی جب مکان کی چھت کی مرمت ہو جاتی۔ کیوں کہ جہیز کے بدلے اس مکان کا لالچ ہی کسی کو پھنسا سکتا تھا۔ پر اب مکان نہ رہا۔"

شریدر جو کا گلا رندھ گیا۔

"دل میلا نہ کرو شریدیر رجُو۔ کوئی نہ کوئی بھلا گھرانا تو مل ہی جائے گا۔"

میں نے ڈھارس بندھانے کے لئے کہہ دیا۔

"نہ تو مل ہی گیا بھیا! فرق صرف اتنا ہوا کہ کوئی برات دروازے پر آکر نہیں رُکی۔ کوئی ڈولی نہیں اٹھی۔ کوئی آنسو نہیں گرا۔"

"میں ـــــــ میں نہیں سمجھا شریدیر رجُو!"

شریدیر رجُو نے میری طرف بھرپور نظر سے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں یکایک آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اُس کا نچلا ہونٹ تھرتھرانے لگا۔

"درگا بھاگ گئی آج تین مہینے ہو گئے۔"

"نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، درگا ایسی لڑکی نہیں۔ تم سٹھیا گئے ہو شریدیر رجُو! اُس نے کبھی گھر سے باہر پاؤں نہیں رکھا۔ میں بولنا چاہتا تھا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ ایسے موقعہ پر کیا کہنا چاہیئے۔ میں صرف پاگلوں کی طرح شریدیر رجُو کے چہرے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

وہ بھرائی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہی کیا بیچاری نے۔ ورنہ اُس کے کنوارپنے کے زہر سے کبھی میرا دماغ چل دیتا۔ اور میں کسی رات اُس کا گلا گھونٹ کر اُسے موت کی تاریکیوں میں دھکیل دیتا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو شریدیر رجُو! تمہارے چہرے پر درگا کے خلاف غصے کی سیاہی کیوں نہیں؟ تم اُسے تلاش کر کے اُس کا خون کر دینے کی بات کیوں نہیں کرتے؟"

اُف! یہ میری زبان کیوں یکلخت بند ہو گئی؟ تم اپنے ناخنوں سے میرا چہرہ کیوں لہولہان نہیں کر دیتے شریدرجو؟ کہیں اس عظیم سانحے سے تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟"

"مجھے کوئی افسوس نہیں۔ کوئی دکھ نہیں۔ صرف حیرت اس بات کی ہے۔ کہ جس لڑکے کے ساتھ وہ گئی ہے اُس کے گھر میں نے ایک مہینہ پہلے ہی پیغام بھجوا دیا تھا اور انہوں نے انکار کر دیا تھا"

"بس کرو شریدرجو! اب تم کچھ مت کہو۔ کیوں کہ جب درگا جیسی لڑکی بھاگ جاتی ہے۔ تو کہیں نہ کہیں ضرور کوئی خرابی ہوتی ہے میرے سامنے سے درگا سے متعلق تمام باتیں ایک ایک کر کے گزر رہی ہیں وہ اس کا متین اور جذبات سے عاری چہرہ وہ اُس کے اُلجھے اُلجھے بال اور گمبھیر سراپا۔ وہ اُس کی خاموشی اور ضبط کرنے کی بے پناہ قوت!"

کہاں ہو تم اسمٰعیل جو کنٹریکٹر؟

آؤ اور دیکھو کہ تم جس گندی مچھلی کی بات کر رہے تھے، وہ کتنی صاف اور اُجلی اُجلی ہے۔ اور تم جس تالاب کی بات کر رہے تھے۔ وہ کتنا گندہ اور تعفن زدہ ہے۔ بلاؤ اپنے قلیوں کو، اور اس تالاب کی ساری گندگی اور کثافت، دُور کراؤ۔ اس سے پہلے کہ یہ دلدل تمہاری ٹانگیں جکڑ لے اس سے پہلے کہ یہ کثافت عورت کی کوکھ تک پہنچ جائے اور ساری نسل، ساری انسانیت کا چہرہ کوڑھ کے پیپ میں ڈوب جائے!

"درگا مجھے بہت یاد آتی ہے بھیّا! میری بچی!!"

شہریار جُو کی آنکھیں ایک جھرنے کی طرح بہہ نکلیں۔
اور آنسوؤں کا ایک دریا میری جانب بڑھنے لگا۔

"درگا مجھے بھی بہت یاد آتی ہے شہریار جُو! کیونکہ میں نے اُس کی خاموشی اور اُس کے ضبط کے ساتھ پیار کیا تھا ——!"
میرے مُنھ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

پرایا آنگن

میرے آنگن میں یاسمن کی جھاڑی پر دیر سے ایک چڑیا بیٹھی چہچہا رہی ہے مٹیالے پروں والی، سُبک خرام۔ نازک سی چلبلی سی چڑیا۔ بالکل تم جیسی۔ کہیں تم ہی سچ مچ چڑیا بن کر میرے آنگن میں تو نہیں آئی ہو؟

مت چہچہا ننھی سی جان! یہ اندر کا بیمار ابھی ابھی سو گیا ہے۔ اسے سونے دے، سونے دے، سونے دے۔

میرے کمرے میں تپائی پر وہ رنگین تصویر ایک خوبصورت فریم میں پڑی ہے جس کا پرنٹ تمہارے لئے بمبئی سے بن کر آیا تھا۔ اور جسے تم نے نہ جانے کس لمحے سے متاثر ہو کر مجھے بخش دیا تھا۔ اس تصویر میں ایک خوبصورت سا لڑکا چیل کے تنے سے ٹیک لگائے مسکرا رہا ہے۔ بالوں کی چند پریشان لٹیں چہرے پر جھک آئی ہیں۔ تمہارا ہاتھ تمہارے ٹورسٹ گائیڈ کے شانے

پر کسمسا رہا ہے۔ لیکن میں اس تصویر کا ذکر کیوں کر رہا ہوں۔ اب تو ہر تصویر تمہاری تصویر نظر آتی ہے ہر نقش تمہارے خدوخال ابھارتا ہے۔ ہر قدم تمہاری منزل کی نشاندہی کرتا ہے۔ تم نے ایک تصویر دے کر شاید اپنا حق ادا کیا۔ میرے پاس بھی چند تصویریں ہیں جن میں تم ہی تم نظر آتی ہو میرے وجود کی پرچھائیاں تک نہیں ہیں۔ دیکھو گی ان تصویروں کو؟ شاید تمہیں میرے وجود کا کوئی بھولا بسرا نشان نظر آئے

یہ گلمرگ ہے۔

چیل کے جھنڈوں سے ہوا ہوئے ہوئے گزر رہی ہے۔ سورج ابھی ابھی بادل کے ایک ٹکڑے کی اوٹ میں چھپ گیا ہے۔

"میم صاحب پونی؟ ایک دم اچھا والا" ایک مسکین صورت دیہاتی کہہ رہا ہے اور تم اپنے خوبصورت بالوں کو جھٹک کر اپنے پپا کی طرف، دیکھ رہی ہو۔ اور تمہارا پپا پونی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اور میں تمہاری کار میں بیٹھا تم دونوں کی طرف، دیکھ رہا ہوں۔

دیکھ رہا ہوں کہ تم متوالی نگاہوں سے ان چیل کے درختوں کی طرف، دیکھ رہی ہو۔ اس دور تک پھیلی ہوئی گھاٹی کو دیکھ رہی ہو۔ ان چمکیلے جسموں والے گھوڑوں کو دیکھ رہی ہو۔ اور ان تمام چیزوں سے متعلق ایک ایک بات اپنے دل میں اتار رہی ہو۔ لیکن میرے لئے ان میں کوئی کشش نہیں ہے۔ یہ میری جانی پہچانی چیزیں ہیں۔ میں نے انہیں نہ جانے کتنی بار دیکھا ہے۔ میری زندگی ہی ہے۔ آج تم لوگوں کے ساتھ۔ کل کسی اور

دوسری پارٹی کے ساتھ۔ یہاں نانا بھانت کے لوگ۔ طرح طرح کے چہرے
قسم قسم کی بولیاں۔ پہلگام سے چندن واڑی تک۔ اہربل سے یوس
میدان تک۔ اچھہ بل سے اونتی پورہ تک۔ سونہ مرگ سے کھلن مرگ تک۔
بقول تمہارے یہ پوُر ٹورسٹ گائیڈ ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ دیکھ کر تھک
گیا ہے۔ ہوا سے تمہارے بال لہرا رہے ہیں۔ تمہارا پپا اگلے موڑ پر نظروں
سے اوجھل ہو گیا ہے۔ ایسا اس پگڈنڈی پر عرصہ تک ہم دونوں کے گھوڑے
جا رہے ہیں۔ پگڈنڈی کے ارد گرد چاروں طرف چیل اور دیودار کے گھنے
جنگل ہیں۔ میں اور تم ساتھ ساتھ جا رہے ہیں۔ تادم یہ قدم۔ تمہارے منہ سے
خوشی کے مارے دبی دبی چیخیں نکل رہی ہیں۔

"تمہارا پپی بڑا اگلی ہے :"

"جی ہاں! میری ہی طرح !!"

"نا بی۔ تم اگلی تھوڑے ہو۔ تمہارا گرل فرینڈ سے پوچھو۔ تم ہینڈسم ہو
کہ نہیں۔"

"میرا کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے :"

"گڈ، تم کتنا جھوٹ بولتا ہے !"

"جی نہیں، سچ کہہ رہا ہوں۔"

"ہم تمہارا فرینڈ نہیں ہے کیا؟"

تمہارا گھوڑا تھوتھنی بڑھا کر میرے گھوڑے کے کان کو سونگھ رہا ہے
گھوڑا آگے بڑھاؤ ہینڈسم صاحب!! ورنہ بہک جائے گا۔ اور تمہیں کسی کھائی میں

گرداب گاہ ـــ :

یہ پہلگام کی تصویر ہے :

ہم لدر کے کنارے بیٹھے ہیں۔ لدر کے پُرفضا کنارے، جس کا پانی زخمی شیر کی طرح دہاڑتا چنگھاڑتا جھاگ بناتا لپکا چلا آ رہا ہے۔ ایک مسلسل شور گھاٹی کے اس کونے سے اُس کونے تک پھیلا ہوا ہے موسم بھیگا بھیگا ہے اور تمہارا پَلّا کالے بالوں والی پیٹھ پر ہے چلا گیا ہے۔ تم بے خیالی میں پانی کے بیچ پڑے ہوئے ایک بڑے سے گول پتھر کو کنکریاں مار رہی ہو۔

"تم کسی سے محبت کرتا ہے ؟"

"طبیعت اس طرف آتی ہی نہیں"

"کیسے نہیں آتی ؟"

"بس نہیں آتی :"

"اچھا یہ بولو، کوئی تم سے محبت کرتا ہے کہ نہیں ؟"

"کوئی نہیں کرتا۔"

"کیسے نہیں کرتا ؟ تمہارا کوئی گرل فرینڈ نہیں ؟"

"نہیں ایک بار کہہ تو دیا ہے کہ ہمارے یہاں گرل فرینڈ نہیں ہوتے شادی کے بعد ایک بیوی ہوتی ہے اور بس ـــ"

تم سر کو جھٹک کر بالوں کی ایک پریشان لٹ کو کندھے کے پیچھے پھینک رہی ہو۔ میں تمہارے تنفس کا اتار چڑھاؤ محسوس کر رہا ہوں۔ لدر کے تیز رو پانی کا مسلسل شور میرے اور تمہارے کانوں میں گونج رہا ہے۔ وہ دور بادل کا ایک

ٹکڑا سورج کے چہرے پر نقاب ڈالنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ لدر کے اُس پار کوئی چرواہا اپنے ریوڑ ہانک رہا ہے اور اچانک بے خودی میں تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ کی انگلیاں ٹٹولنے لگا ہے۔ اپنے ہاتھ کو روک، لو۔ اپنے جذبوں کو سنبھالو اپنی خوشبو کو مت بکھرنے دو فضاؤں میں اپنے سینے کا زیرو بم چھپاؤ میری نظر ڈرتی ہے۔ ابھی تمہارا پاپا وہسکی کے نشے میں دھت جھومتا جھامتا آجائے گا اور ایک اعزیز، یہ ٹورسٹ گائیڈ کی نوکری خطرے میں پڑ جائے گی

"آؤ ہم فرینڈس ہو جائیں !"

تمہارا ہاتھ اُسی طرح میرے ہاتھ کو سہلا رہا ہے۔ میں کچھ نہیں سمجھ رہا ہوں، ایک اذیت ناک لمحہ گزر رہا ہے بادل کا وہ ٹکڑا سورج کے چہرے پر نقاب ڈالنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

"آؤ ہیلیں، تم ہم کو پیار کرتا ہے"

یہ تصویر دُولر کی ہے۔

حدِ نگاہ تک پانی ہی پانی ہے۔ ایک رام چڑیا دُولر کے پانی میں غوطہ لگا گئی۔

"ارے ڈوب گئی بے چاری !" تم چیخ رہی ہو۔

"یہ نہیں ڈوبتی !"

"کیسے نہیں ڈوبتی بے چاری ڈوب ہی تو گئی"

"یہ مچھلی تلاش کرتی ہے اسے غوطہ لگانے کی عادت ہے !"

"تمہیں کسی چیز کی عادت نہیں ہے ؟"

یہ تم گھوم پھر کے بات میرے اوپر کیوں لے آتی ہو ؟ تم میرے بارے میں بہت سوچتی ہو میم صاحب ! وہ ڈل کی لہریں دیکھو، جیسے دل کی جھیل میں جوار بھاٹا آیا ہو۔ یہ ترسری کے درخت، دیکھو۔ قطار اندر قطار، جیسے کسی مجنوں نے دل کے نہاں خانے میں ارمان سجائے ہوں۔ اور اُودی اُودی گھٹاؤں کے پیچ و خم دیکھو، جیسے کسی کی زلفِ شکن در شکن پریشان ہو گئی ہو۔ وہ ایک ناؤ لہروں پر ڈول رہی ہے۔ وہ ایک چیل ہواؤں کے دوش پر تیر رہی ہے۔ وہ ایک مرغابی پانی کی سطح پر گردن اونچی کرکے اپنے ساتھی کو ڈھونڈھ رہی ہے۔ تم میری طرف مت دیکھو۔ تم مناظر دیکھنے آئی ہو۔ چہرے تو تمہیں بمبئی میں بھی نظر آئیں گے۔

"اے !"

"کیا ہے ؟"

"تم کیسا ٹورسٹ گائیڈ ہے۔ تم ہمیں اس جھیل کا جل پری کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہتا ہے"

"اس جھیل میں کوئی جل پری نہیں رہتی۔ ایک ناگ کا دیوتا رہتا ہے۔ اور بس !"

"تم کو جل پری اچھا لگتا ہے نا ؟"

"میں نے تو کبھی کوئی جل پری نہیں دیکھی ہے۔ دیکھوں تو بتا دوں !"

"تو دکھاؤں ؟"

"کیسے ؟"

"بس : پانی میں اتر کے "

نہ جانے تم کن رمزوں کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ کن کنایوں سے کام لیتی ہو۔ میں کبھی تمہارے اشارے سمجھنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا ہاتھ بہت چھوٹا ہے اور تمہارا گریبان بہت اونچا۔ اگر میں جست لگا کے تمہارے گریبان کو پکڑ لوں بھی تو تمہارا گریبان پھٹ جائے گا۔ اور میں ایسا گروں گا کہ پھر کبھی نہ اٹھ سکوں۔ اپنے اس پور ڈیرسنٹ اگاڈ پر رحم کرو میم صاحب۔ کسی خیال میں بہہ گیا۔ تو عمر بھر کنارہ نہ پا سکے گا۔ کسی تصور میں کھو گیا۔ تو ابد تک کھویا ہی رہے گا . . . . . .

اس تصویر میں یہ بوڑھا چنار دیکھ رہی ہو نا؟ یہ وہی چنار ہے جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں تم نے اپنے بال کھول دئے تھے۔ اور ایک گھٹا لہرا کے رہ گئی تھی۔ یہ گھٹا آج بھی میرے ذہن میں لہرا رہی ہے۔ اور سچ [illegible] یہ بادل تب سے کبھی چھٹے ہی نہیں۔ جدائی کی ایک کالی لمبی بھیانک رات کی طرح یہ میرے سامنے دھند پر چھا گئے ہیں۔ تم چنار کے تنے سے ٹیک لگائے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کھرچ رہی ہو۔ تمہارے بال سرخ ربن میں بندھے ہوئے تمہارے شانوں پر ڈھلکے آئے ہیں۔ ان کا ایک ابھار زمین کو چھو رہا ہے۔

"اے مسٹر! یہ تم ایک ٹک اسے ہماری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں، ایسے ہی۔"

"اے کم آن: یہ تو کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں بس ایسے ہی دیکھ رہا تھا۔"

"گوڈ! تم کتنا جھوٹ بولتا ہے۔ تم کو ہمارا قسم سچ سچ بولو نا!"

"تمہارے بال دیکھ رہا تھا۔ بہت اچھے ہیں۔"

"تم بڑا ناٹی ہے۔ کھول کے دکھاؤں؟ ہم کو بھی اچھا لگتا ہے۔"

تم نے بال کھول دئے۔ خوشبو کی ایک لہر اٹھی بڑھی اور سب پھیل گئی اندر بوڑھے چنار کے پتے تھر تھرائے۔

میں چاہ رہا ہوں۔ کہ ان بالوں کو چھو کر دیکھوں۔ ایک انگلی پر ان میں سے کسی لٹ کو لپیٹنے لپیٹتے سو جاؤں کسی کے زانو پر سر رکھ کے۔ لیکن میں اس خواہش کو دل ہی دل میں تھپک تھپک کر سلا رہا ہوں۔

آج یہ خواہش جاگ اٹھی ہے تم تو بہت دور چلی گئی ہو اور اتنی بڑی ہو گئی ہے یہ خواہش کہ لوری سنانے سے بھی نہیں سوتی۔ تھپک تھپک کر بھی نہیں سوتی سوچا ری! ننھی سی خواہش کی دنیا سوچا۔

بارش کے قطرے ٹپ ٹپ ٹینگل کی چھت پر گر رہے ہیں۔ کھڑکی کے شیشے سے اس حمام کے کھنڈر نظر آ رہے ہیں۔ جو کسی زمانے میں چراغ کی لو سے گرم کیا جاتا تھا۔ اور جس میں کوئی بادشاہ گرم پانی کے فوارے کے نیچے بیٹھ کر آنکھیں نیم وا کئے سنتور کے نغموں سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ لیکن یہ تاریخ کی باتیں ہیں جس طرح اچھہ بل کے ڈاک بنگلہ کی یہ تصویر تاریخی چیز ہو کر رہ گئی ہے ایسی تصویریں بھی تم ہی تو ہو۔ یا یہ شاید میری اپنی نظر کا دھوکا ہے۔ میں کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھا بارش کے قطرے گن رہا ہوں۔ تم دوسرے

کمرے میں اپنے پتا کے ساتھ رمی کھیل رہی ہو۔ جھکے بادلوں میں بجلیاں ناچ رہی ہیں۔ برآمدے میں ایک گجراتی نوجوان اپنی نئی نویلی دلہن کے بالوں میں پھول لگا رہا ہے۔

"تمہاری سوچوں کے لئے دس نئے پیسے"

"سوچیں بکاؤ نہیں ہوتیں۔"

"پھر بتاؤ کیا سوچ رہے تھے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ بارش دیکھ رہا تھا۔"

"گوڈ! تم کیسا بدھو آدمی ہے تم ہمارے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔"

"تمہارے بارے میں میں کیوں سوچتا بھلا؟"

"ہوں! میں پتا کے ساتھ رمی کھیل رہا تھا نا، تو صرف تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایک بھی پوائنٹ نہیں جیتا۔"

"تم میرے بارے میں کیا سوچ رہی تھیں؟"

"میں سوچ رہا تھا کہ مجھے تمہارے ساتھ لو ہو گیا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"کیوں؟ کوئی گالی دیا میں نے؟"

ہائے میں تم کو کیسے بتاؤں ابراہیم صاحب کہ تم نے مجھے کتنی بڑی گالی دی ہے۔ آج میں اس گالی کی تلخی کو اپنے بہت اندر تک [illegible] کے [illegible] اٹھتا ہوں۔ گوبھی کے پاس عشق بیچاری کی [illegible]

تم گلدان میں سے یونہی ایک پھول کاٹ کر میرے ہاتھ میں تھما رہی ہو۔

"یہ پھول میرے بالوں میں لگا دو گے؟"

"یہ تم کو آج کیا ہو گیا ہے۔ تم جا کر اپنے پپا کے ساتھ رمی کیوں نہیں کھیلتی"

"پپا بے چارے تو سو گئے۔ یہ پھول لگا دو نا میرے بالوں میں۔"

میں تمہارے بالوں میں پھول لگا رہا ہوں۔ میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں میرے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اُبھر رہی ہیں۔ اور اچانک بے خبری میں تمہاری باہیں میرے گلے میں جھول گئی ہیں قینچی کے ایک لمس سے یہ کیسی بے دردی سے پنچھی کے شہ پر کاٹ دیئے۔ قفس کی تیلیاں چاروں طرف پھیل گئیں۔ باہر بادل زور سے گرج رہے ہیں بجلیاں چمک چمک کر کھڑکی سے اندر آ رہی ہیں عشق پیچاں کی بیلیں بارش کی پھوار میں اُسی طرح نہا رہی ہیں کاش یہ بارش کمرے کے اندر گھس آئے۔ جانے کمرے میں ہوا اس قدر بوجھل کیوں ہے۔ جانے کمرے کی دیواریں اس قدر کیوں تپ رہی ہیں باہر شاید بخار کی غنودگی میں کھو گئی ہے ایک سرد ہوا کا جھونکا اس کمرے کے اندر بھی بھیج دو میرے معبود! میں نے یہ لمحہ تم سے کبھی نہیں مانگا تھا کبھی نہیں!!

اچانک عشق پیچاں کی کلی نے ہونٹ کھولے جیسے خوشبو پھیلنے لگی پھیلتی رہی بے چاری کلی! کوئی اُسے کیوں کر سمجھائے کہ اس خوشبو کے اندر کونسی موت پنہاں ہے؟

تمہاری آنکھوں میں اُس رات کوئی موت پنہاں نہیں تھی۔ جب وہ میرے بازو میں کھب گئی تھیں۔ کھب گئی تھیں۔ تمہارا چہرہ تو موت کا چہرہ تھا

ہنیں تھا پھر یہ میرے دل میں ابھر کا بھاری پتھر کس کی کاوش کو ڈھکے رہا ہے کاش اس کاوش کی کوئی تصویر میرے پاس ہوتی۔

دامودر ائرپورٹ کے ویٹنگ روم میں تم اور میں، دونوں ایک ہی صوفے پر بیٹھے ہیں۔ تم نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھا لیا ہے میری آنکھیں حیران حیران چاروں طرف دیکھ رہی ہیں۔ پر اصل میں کسی طرف بھی نہیں دیکھ رہی ہیں۔ تمہارے پتا باہر کسی آدمی کے ساتھ بات کرنے میں مشغول ہیں —

"ششی! خط لکھو گی نا؟"

"ہوں!"

"کبھی مجھے یاد کرو گی؟"

"ہاں جب کشمیر کی یاد آئے گی۔ تو تم ضرور یاد آؤ گے"۔

"ورنہ نہیں؟"

"بمبئی میں ہم لوگ بڑا بزی رہتا ہے!"

"مگر تم کو میرے ساتھ پیار ہو گیا ہے۔ ہے نا؟"

"پسنجر جہاز کی طرف جانے لگے ہیں چلو!"

"لیکن ششی! میں اس محبت کا کیا کروں جو تم نے ڈھیرے ڈھیرے میرے دل میں جگائی ہے"؟

"فارگٹ اٹ! تم میرے بہت اچھے دوست ہو کشمیر میں تمہارے ساتھ بہت اچھا ٹائم پاس ہوا۔ چلو پتا تو جہاز میں داخل بھی ہو گئے"

میری آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔

جہاز ہوا میں ناچ رہا ہے۔

دور کوئی تتلی کھڑا آنکھیں پونچھ رہا ہے، رو رہا ہے بے چارہ!

"اے کم آن! جذباتی مت بنو۔ دیکھو یہ بیگ اٹھاؤ۔ جہاز میں سب لوگ بیٹھ گیا ہے، اچھا بابا ہم تم کو خط بھی لکھیں گے۔ تمہیں یاد بھی کریں گے۔ اب تو آؤ!"

دور کوئی جھنڈی ہل رہی ہے۔

کوئی سیٹی بج رہی ہے۔

مسلسل بجتی جا رہی ہے۔

کوئی پپیہا رہا ہے

ہنسی کا ایک چھناکا بکھر گیا ہے ——!

مت پپیہا او ننھی سی جان! یہ اندر کا بیمار ابھی ابھی سو گیا ہے۔ اسے سونے دے! سونے دے!! سونے دے!!!

●●

میرا گاؤں

تھوہڑ کی خاردار جھاڑیوں کے اُس پار ایک نالہ ہے اور نالہ کے اُس پار میرا گاؤں ہے۔ اس نالے میں برسات کے دنوں میں پانی آتا ہے۔ اور برسات سے پہلے یہ ایک گول پتھروں سے بھری ہوئی خندق دکھائی دیتا ہے ـــــ

تھوہڑ کی جھاڑیوں کے اس پار زہریلے قسم کے سانپ پلتے ہیں

لوگو! مجھے اٹھا کر پٹاخے کی طرح کسی پتھر کے چہرے پر دے مارو۔ میرے گاؤں کی آستین میں سانپ پلا کرتے ہیں ـــــ ادھر لکھی رام درزی اپنی پہلی جنگِ عظیم سے پہلے کی بنی ہوئی سنگر مشین پر بنتو کی شلوار سی رہا ہے، اور ادھر دھنی رام پٹواری اپنی کھتونی میں اندراج کرتا ہے۔ یہ دھنی رام پٹواری بڑا حرامی ہے بنتو کو دیکھ کر اس کی کھتونی کے اندراج غلط ہو جاتے ہیں، اور یہ رام دن کے خانے سے دو کنال چودہ مرلے زمین نکال کر بنتو کے خانے میں درج کرتا ہے، چلو انتقال

ہوگیا۔ سماۃ بنتو ولد لچھمن داس ذات کھتری، ساکن منہ غنع ـــ ہائے: دھنی رام
کی آنکھ بھینگی نہ ہوتی تو کیا ہوتا ـــ ؟

یہ بنتو بڑی طرحدار لڑکی ہے۔ کنڈی واٹر سپلائی کے بنائے ہوئے پختہ حوض پر پانی بھرتے ہوئے جھگڑا کرتی ہے۔ اور اُس کا یار کنڈی واٹر سپلائی کے ٹرک میں بیٹھا مُسکراتا ہے بڑی بُری لڑکی ہے جی یہ بنتو، اسے بھی گولی مار دیجئے۔

میں نے ابھی وہ تصویر مکمل نہیں کی ہے جس میں، میں نے ایک ہرا بھرا پنگھٹ دکھایا ہے ـــ بنتو ڈول کھینچ رہی ہے اور کنڈی واٹر سپلائی کے ٹرک کا ڈرائیور اپنے دونوں ہاتھوں کی اوک بنا کر پیاسا ہے۔ اور برگد کی ٹہنیوں سے جھولے لٹک رہے ہیں۔ اور بنتو کی سہیلیاں جھولوں پر بیٹھی گرجت برست ساون آیو رے گا رہی ہیں ـــ ایسے میں کیا ہوا جی؟ کہ دھنی رام پٹواری تھوہڑ کی جھاڑیوں کے پیچھے سے کھنکارا اور بنتو کے ہاتھ سے ڈول کی رسی پھسل گئی۔ اور ڈول ایک لمبی آہ بھر کر نیچے تہہ سے جا لگا۔

اور کھتونی میں اندراج ہوا کہ دھنی رام پٹواری کو تھوہڑ کی جھاڑیوں کے پیچھے ایک زہریلے سانپ نے ڈس لیا ـــ مار دیجئے گولی دھنی رام پٹواری کو۔ بھلا کھتونی میں ایسی بات کا اندراج ہو سکتا ہے۔؟

کبوتر زور سے چیخ رہا ہے۔ بی بنتو! اٹھو۔ اری اٹھ جلنیئے! پانی آگیا۔ کہاں آیا پانی ماں؟ یہ تو تیرے کان پر مچھر گنگنا رہے ہیں۔ بنتو کروٹ بدل کر چادر سر کے اوپر کھینچ رہی ہے ٹرک کے ڈرائیور کا نام رام رکھا ہے اور ے سچ ماں؟ پانی واقعی آگیا۔؟

اے گوبندے : ابے کائر، بزدل! تو گوبندا ہے؟ تو تو بندر گوبیلا ہے

چل ہٹ! آگ لگے تیری جوانی کو، ہمارے جملے تیں یہاں دہ دہ رہٹ گھوما کرتے تھے۔ گھُمر گھُمر ا ب، تو یہ موا ہمنٹ کا حوض چلتا ہے۔ وہ نہاتے ہوگئے نہائے ہتے مگر یہ حوض نہیں گھومتا۔

گھوم جا ——

گھوم گیا ——!

تو کون ——؟

رام رکھا ——

چل دفعان ہو جا۔ جب دیکھو مونچھوں پر تاؤ دئے رہا ہے۔ ابے تو کبھی کام کی بات بھی کرے گا یا یونہی بکتا جائے گا۔

ہجور! پنچوں کا فیصلہ سر آنکھوں پر۔ پر ہجور! میں نے اپنی ان دو آنکھوں سے دیکھا حضور —— وہ بنتا ہے ناجی! وہ دو گاگر پانی کے لے گئی۔ اے دہائی ہے پنچوں کی۔ شرکار یہ موا ایک آنکھ بھینگا ایک گاگر کی دو نہ دیکھے تو پھر کون دیکھے —— ؟

مگر یہ تصویر مکمل نہیں ہو رہی۔ آخر کیسے مکمل ہو گی۔ اے گوبندے تیری منجھ کے بیچ ضرور کوئی خرابی ہے۔ دیکھ جگالی کر رہی ہے۔

ہے رام! کیسا زمانہ آ لگا ہے۔ رامائن میں شری کرشن مراری کی کہانی ہیں۔ تیری لیلا اپرم پار —— پورنماشی کی رات ہے۔ آکاش پر چندرما چمک رہا ہے اور ایودھیا پوری میں پیپل کے نیچے شری رام چندر جی راس لیلا رچا رہے ہیں

گوپیاں ناچ رہی ہیں۔ بانسری کی تانیں اڑ رہی ہیں۔

بنتو! اری اٹھ ایسو نہو بج رہا ہے۔ پانی آگیا ہے۔

کہا آگیا ماں ! ۔۔۔ یہ تو ۔۔۔ یہ تو ۔۔۔

ارے جیندہ رہ بیٹیا! تو بنتو کا بڑا خیال رکھتا ہے یہ نگوڑیاں تو اسے ایک بونا نہ بھی جانے دیں۔ ارے پنوارسی! کیوں اپنی بے عزتی کروایا کرتا ہے۔ میں گھرمنٹ کا آدمی ہوں۔ تو بھی گھرمنٹ کا آدمی ہے۔ میرا تمہارا سانجھا تو جنم جنمانتر کا ہے چل آ۔ دو گھونٹ پانی کے پیتا جا ۔۔۔

اچھا بدلے لگا رے۔

انکھائیں ہمارے۔

پانی دے۔

ارے پانی دے!

ارے رام دئی! تیرے آدمی کا کیا حال ہے۔ سنا ہے کہ ویدجی کہہ گئے ہیں بچنے کی کوئی امید نہیں۔ اے ہے لالہ بچنے کی امید تیرے ہوتے سوتوں کو نہیں ہوگی۔ میرا آدمی تو جوان ہے جوان۔ تیری طرح کوئی اسی سال کا کھوسٹ ہے اچھا بلغم تھوکتے ہی امانت دے جائے۔

ہی ہی ہی ۔۔۔ تو بات اچھی سمجھتی ہے رام دئی

ہائے گولی رام دئی کو بھی ۔۔۔ بات اس تصویر کی ہو رہی ہے جسے میں مکمل کر رہا ہوں اس تصویر میں ایک جھر جھر کرتا ہوا جھرنا بہہ رہا ہے۔ اور جھرنے کے کنارے پیپل کا درخت کھڑا ہے اور اس درخت کی شاخوں میں بادِ نسیم

اٹھکیلیاں کرتی ہے۔ ہے، تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں۔؟ جھرنے کے کنارے بنتو بے زار بیٹھی ہے۔ اور اس کے ریشمی بالوں میں گلاب کی مہک بھر گئی ہے اور اس کے ٹخنوں میں جھانجھنیں بج رہی ہیں۔

دھنا دھنی رام کی بھینگی آنکھ چیل کے چھتنارے سے گر کر نرم نرم گھاس پر پلکیں جھپکنے لگی۔ اے بنتو رانی! تم نے بھوپو کی آواز تو نہیں سنی۔ چل ہٹ! بھوپو کا ہوتا سوتا...... اتنے میں رام دئی نے تالی بجائی۔ اور دھنی رام کی بھینگی آنکھ پھیل گئی۔ اور پھیل کر سارے گاؤں کو اپنی پیٹ میں لے آئی۔

اُف! یہ تو صبح ہی صبح گرمی کا حال ہے۔ دوپہر تک تو بدن پر آبلے پڑ جائیں گے۔ اتنے میں کیا ہوا جی! کہ کنڈی دار سپلائی کے ٹرک کا ڈرائیور رام رکھا آگیا اور بنتو کے ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگا۔ اور اس کا کلینر انجن میں موبل آئل ڈالتا رہا۔ یہ بنتو بڑی بے شرم ہے۔ الف ننگی گھاٹ پر لیٹی ہے۔

فضا میں دھول اڑنے لگی اور پہروں پر چپک گئی جھونپڑوں کی مٹی کی دیواریں تپ رہی ہیں۔ اور رام دئی جو کے آٹے کی روٹیاں بنا کر ان دیواروں پر کھپا کھپ تھوپ رہی ہے۔ تنور ہے جی۔ پر یہ تو بہت تیرے کی اُپلے۔

مگر میں سبز رنگ کہاں سے لاؤں؟ ابھی ان پتیوں میں سبز رنگ بھرنا ہے۔ اس چیل کے چھتنارے کے لیے سیاہی مائل گہرا سبز رنگ درکار ہے۔ اری بنتو! تو اٹھ کر سبز رنگ کی تلاش اب بہن۔

ٹیاؤں ـــــ ٹیاؤں !!

چل ہٹ ! سوکھے سڑیل خارش زدہ کتے ! تو اپنی پتلی زبان گز بھر لٹکائے کس کا انتظار کر رہا ہے ـ ؟

لے بنتو اُٹھ جا نہیئے ! پانی آ گیا ہے ـــ یہ بند گوپے کی منجھ سارا پانی پی جائے گی ـــ پھر تو کس کے ساتھ بیاہ کرے گی ـ ہائے ! کوئی دو دن سے بھی نہایا ہے ـ تیرا باپو اب تک اپنی زندگی میں صرف چھ بار نہایا ہے اور تیرا دادا تب نہایا تھا جب اُسے شمشان لے جانے کے لئے سنوارا جا رہا تھا ـ

اُئے پٹواری جی ! کیوں جنم کرتا ہے ـ میری بنتو تو ابھی بچی ہے تم اُسے جی بھر کے نہانے تو دو ـــ پھر یہ تیری جورو بنے گی ـ اور اور سبز رنگ کی شلوار پہنے گی ـ

گہرا سبز رنگ کہو جی ـ یہ چل کے چھینٹے ورنہ پتوں سے محروم رہ جائیں گے ـ

سانپ !

کہاں ہے ـ ؟

ارے ادھر تھوہر کی جھاڑیوں میں

چپ رہ بیٹیا ! ان جھاڑیوں میں سانپ کب ـ ٹھہر تجھے ـ ہٹو ہٹو ! کوئی سانپ نہیں ہے ـ یہ تو میں ہوں ـ کیوں ری بڑھیا ؟

تم اس بنتو کو کچھ کھلاتی پلاتی نہیں ؟ یہ اس کے گال مرجھا کیوں گئے ہیں

یہ اُس کے بالوں میں ساون کی گھٹائیں کیوں نہیں رہیں ۔۔۔؟

میں یہ مٹیالا اسوکھا بے رونق بے رنگ ویو چہرہ کس برش سے بناؤں گا ۔۔۔؟

اور میرے پیارے مسٹر ہر بھگوان جب پنگھٹ پر مٹیاروں کی قطار سروں پر چھم چھم کرتی گاگریں سجائے، ساون گاتی ہیں تو ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ میں زوردار لفظوں میں سفارش کرتا ہوں۔ کہ آپ یہ سین گیو اکلر میں بنائیے ماسٹر پیس بن جائے گا۔

ساتے یو اکھتونی میں اندراج تھا۔ گو بندے کی بھنجھ گرمی کی شدت سے دم توڑ گئی۔

دم توڑ دینا گو بندے کی بھنجھ کا اور کرنا تکیوں کا ناچ جمنا کنارے،

اچانک کیا ہوا سجنو اور بھگوت پریمیو! کہ جمنا کے کنارے نٹ کھٹ نند لعل نے کنکریا مار کر ایک گوپی کا گھڑا توڑ دیا

ماں، یہ جمنا کا کنارہ کیا ہوتا ہے ۔۔۔؟

ارے پتر چپ رہ۔ کتھا نہ یا کھیان میں ایسی بات نہیں کرتے۔ تم گو بندے کی ماں جمنا کو جانتے ہو نا؟ بس وہی ۔۔۔

تو بیچارہ رام دئی۔ تیرے مرد کا کلیان ہو گا۔ جگت کا کلیان ہو گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے جگت کلیان ہو گیا۔ اور کھوتڑی کی خاردار جھاڑیوں سے لمبے لمبے سانپ پھنکاریں مارتے ہوئے نکلے اور رام دئی کے پیٹ میں گھس گئے۔

بچاؤ!

بھونپو زور سے بج اٹھا اور کنڈی نائٹ سپلائی کے ٹرک نے اپنا منہ کھولا۔ اور گرم گرم موبل آئل بہہ کر تپتی ریت میں جذب ہو گیا۔

تم چپ رہو! خارش زدہ دبلے پتلے مریل کتے۔ سمیٹ لو اپنی، پتلی سی گز بھر لمبی زبان کو۔ یہ ریت چاٹنے سے تیری پیاس تو نہیں بجھے گی؟ —

بہو! بیٹی اٹھ! اری اٹھ سرہانے۔ پانی آگیا۔

ارے سچ ماں؟ پانی واقعی آگیا ہے —؟"

مار دیجئے گولی — پھر کس کس کے گولی ماریئے۔

اُف! گولی مار دی گئی — یہ سرخی مائل مٹی کی دیواریں آگ برسا رہی ہیں۔ گرم ہواؤں کے جھکڑ چل رہے ہیں کھیتوں میں کھڑی سنہری رنگ کی بالی پسینے میں شرابور ہو رہی ہے۔ آسمان کی گہرائیوں میں گدھ ناچ رہے ہیں۔

ابے لکھی رام! تم یہ لوگوں کے کپڑے کیوں پھاڑ رہا ہے —؟

آؤ! میرے کپڑے پھاڑ دو — مجھے تھوہڑ کی خاردار جھاڑیوں میں پھینک دو — اس خارش زدہ مریل کتے سے کہہ دو کہ میرا بدن چاٹ لے — اب پسینہ بھی نہیں بہہ رہا۔

آ جا بدرا کالے۔

انگنا میں ہم لے۔

پانی دے!

ارے پانی دے!!

یکایک آسمان کی گڑگڑاہٹ سے ایک تصویر گر کر میرے سامنے ریزہ ریزہ ہو گئی۔ ارے اس تصویر کے ٹکڑے سمیٹ لو یہ تو بیکنٹھ ہے کل کل کرتی ہوئی ندیاں سرسراتے ہوئے چیل کے گہرے سائے جھر جھر کرتا ہوا یخ بستہ پانی کا جھرنا۔ چھم چھم کرتی ہوئی تتلیاں۔ نہ جانے کس کے ٹخنوں میں جھانجھیں بج رہی ہیں۔ گویا نے کی مٹھ دودھ دے رہی ہے اودی اودی گھٹائیں رم جھم برس رہی ہیں آم کے درختوں پر بور آئی ہے

چھنن ن۔

بیکنٹھ کا دروازہ بند ہو گیا ہے اور ایسے میں کیا ہوا کہ کھنڈر کی جھاڑیوں میں سے ایک کالا لمبا، بھیانک سانپ نکلا اور میرے گلے میں حمائل ہو گیا۔ اور تصورات کی پرچھائیاں ڈوب گئیں۔

ایک گہرا ایسا بھیانک اندھیرا چاروں طرف سے ابھر رہا ہے مجھے کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا۔ میں اندھا ہو گیا ہوں۔ بھگتو میں اندھا ہو گیا ہوں۔

لوگو! مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ مجھے اٹھا کر پٹاخے کی طرح بنتہ کے منہ پر دے مارو، کیونکہ مجھے اپنے گاؤں میں کہیں بھی بیکنٹھ کا دروازہ نہیں مل رہا۔

نیلے امبر تلے

نیڈرونڈ کے بار روم میں جان ہیگ کا جام منہ سے لگاتے ہوئے
مراری لال ہلدی نند لال نے سامنے بیٹھی مس جین نند لال کے خوبصورت چہرے
کی طرف تکتے ہوئے کہا ——
" جان من : یہ گلمرگ کتنی پیاری جگہ ہے ۔ دو ہفتے یہاں گزار کر میں
نے یہاں کے فارغ البال لوگوں کے رومان اپنی کتاب میں خوب مزے
لے لے کر لکھے ہیں ——
آج اس کتاب کا آخری حصہ ختم کروں گا —— بیرا —— "
اور جب بیرا آگیا تو باہر چلیا اور صنوبر کے درختوں کے اوپر سے چاند اپنا
تھکا ماندہ یرقانی چہرہ لئے نمودار ہو گیا
چاند کے نمودار ہوتے ہی ململ کے سفید سفید اور مہین دوپٹوں نے ساری

چیزوں کو اپنی باہوں میں چھپا لیا۔ فضا میں نشہ سا انڈیل گیا۔ رگوں میں خون کی روانی تیز ہو گئی۔ زلفوں میں مہک ابھر گئی۔ باہوں میں گداز اور لوچ پیدا ہو گیا۔

—— شاعر کے تخیل کی آخری منزل —— گلمرگ :

اور نیڈیوز سے کچھ ہی دور ممدو کے کٹھار میں خدیجی نے دیا جلا دیا۔ جس طاق پر یہ دیا جلایا گیا وہ بہت ہی میلا کچیلا تھا۔ کڑوے تیل کی باس میں بسا ہوا —— اسی طاق کے نیچے ممدو کی ماں شاہمالی بیٹھے چرخہ کاتتی تھی۔ اور چرخہ کاتتے کاتتے دبی زبان میں کوئی پہاڑی گیت گنگناتی رہتی تھی۔ ان گیتوں میں کنوارے پنے کی شوخی۔ شادی کا سنگار اور بڑھاپے کی مجبوریاں بھری ہوتیں چرخے کی گھوں گھوں میں موسیقی کی لہریں ابھر ابھر کر ڈوب جاتیں اور شاہمالی اپنا گیت گاتے گاتے اونگھنے لگتی۔ اونگھتے اونگھتے وہ خواب دیکھتی اور ان خوابوں میں کٹھار کے بجائے ایک مکان ہوتا —— کچی پکی اینٹوں کا بنا ہوا مکان۔ مکان میں پوتے اور پوتیوں کی ملی جلی ہنسی ہوتی۔ آنگن میں بادام کا درخت ہوتا، اور درخت سے ہٹ کر چار پانچ سجیلے ٹٹو ہوتے —— اور بس! جنت میں اتنی ہی چیزیں تو ہوتی ہیں —— اور کیا چاہیے!!

کبھی خواب دیکھتے دیکھتے شاہمالی چونک اٹھتی۔ اور مٹمیالی آنکھیں جھپکاتی ہوئی خدیجی کی طرف دیکھ کر کہتی —— سن خدیجی! میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ —— اور خدیجی منہ بنا کر کہتی: تم تو خواب ہی دیکھتی ہو روز —— کہکر کیا ایک کان کسی آہٹ پر لگا دیتی —— جانی پہچانی

آہٹ جو عورت مردوں کے چلنے سے پیدا ہوتی تھی ——

مگر یہ تو پہلے کی بات تھی۔ تب سے بہت کچھ بدل گیا تھا۔ شاہمانی خواب دیکھتے دیکھتے ان کی بھول بھلیوں میں اتنا کھو گئی تھی کہ اُسے قبر کی تہوں میں اتارنا پڑا تھا تاکہ وہ ہمیشہ سوتی رہے۔ اور خواب دیکھتی رہے، اور اسے جگانے والا کوئی پاس نہ ہو۔

شاہمانی کے مرنے کے بعد خدیجی کو یہ کٹھارا کتنا سونا سونا سا لگتا تھا۔ وہ پہروں دروازے پر بیٹھ کر دُور پرے میدان کے آس پاس لوگوں کو گھوڑوں پر بیٹھے چلتے دیکھا کرتی —— ان عورتوں کو دیکھا جو مردوں جیسا پوشاک پہنے بہت پھرتی سے پٹھولن کا کھیل کھیلا کرتی تھیں —— ان بچوں کو دیکھتی جو چھوٹے چھوٹے دستانے پہن کر اور ننھی منھی جرابیں پہن کر بہت سے گھیرے بنا کر تالیاں بجاتے تھے —— وہ دیر تک ان چیزوں کو دیکھتے دیکھتے ان میں کھو جاتی —— حتیٰ کہ اندھیرا اتر آتا۔ اور بچے اپنی آیاؤں کے ساتھ چلے جاتے، عورتیں اپنے مردوں کے کندھوں سے لگی چلی جاتیں —— اور ٹٹو والے، اپنے ٹٹو سنبھالے چپ چاپ اپنے کٹھاروں کو لوٹ آتے —— ان لوٹنے والوں میں اُس کا ہمدرد بھی ہوتا، اپنے ٹٹو کی راس پکڑے ہوئے اندر جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوتا۔ تو وہ بچوں کے سے انداز میں مچل مچل کے پوچھتی —— آج تمہارے ٹٹو پر کون بیٹھا تھا ہمدرد —— ؟ وہ عورت تو نہیں جو مردوں جیسا پوشاک پہنے تھی —— ؟ وہ مرد تو نہیں، جو ٹٹو پر بیٹھ کر تھر تھر کانپنے لگتا تھا —— ؟ وہ —— وہ بچہ تو نہیں جس کے گال ٹماٹر کی طرح سرخ سرخ تھے —— ؟

چیزوں کو اپنی تہوں میں چھپا لیا۔ فضا میں نشہ سا انڈیل گیا۔ رگوں میں خون کی روانی تیز ہو گئی۔ زلفوں میں مہک بھر گئی۔ بانہوں میں گداز اور لوچ پیدا ہو گیا۔

—— شاعر کے تخیل کی آخری منزل —— گلمرگ!

اور نیلے روز سے کچھ ہی دور ممدو کے کٹھار میں خدیجی نے دیا جلا دیا۔ جس طاق پر یہ دیا جلایا گیا وہ بہت ہی میلا کچیلا تھا۔ کڑوے تیل کی باس میں بسا ہوا —— اسی طاق کے نیچے ممدو کی ماں شاہمالی بیٹھے چرخہ کاتتی تھی۔ اور چرخہ کاتتے کاتتے دبی زبان میں کوئی پہاڑی گیت گنگناتی رہتی تھی۔ ان گیتوں میں کنوارپنے کی شوخی۔ شادی کا سنگار اور بڑھاپے کی مجبوریاں بھری ہوتیں چرخے کی گھوں گھوں میں موسیقی کی دھاریں ابھر ابھر کر ڈوب جاتیں اور شاہمالی اپنا گیت گاتے گاتے اونگھنے لگتی۔ اونگھتے اونگھتے وہ خواب دیکھتی اور ان خوابوں میں کٹھار کے بجائے ایک مکان ہوتا —— کچی پکی اینٹوں کا بنا ہوا مکان۔ مکان میں پوتے اور پوتیوں کی ملی جلی ہنسی ہوتی۔ آنگن میں بادام کا درخت ہوتا، اور درخت سے ہٹ کر چار پانچ بھیڑیں ٹٹو ہوتے —— اور بس! جنت میں اتنی ہی چیزیں تو ہوتی ہیں —— اور کیا چاہئے بھلا!

کبھی خواب دیکھتے دیکھتے شاہمالی چونک اٹھتی۔ اور مٹمیالی آنکھیں جھپکاتی ہوئی خدیجی کی طرف دیکھ کر کہتی —— سن خدیجی! میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ —— اور خدیجی منہ بنا کر ہاں: تم تو خواب ہی دیکھتی ہو روز —— کہہ کر اپنے کان ہاں کسی آہٹ پر لگا دیتی —— جانی پہچانی

آہٹ ا جو عورت مرد کے چلنے سے پیدا ہوتی تھی ——

مگر یہ تو پہلے کی بات تھی۔ تب سے بہت کچھ بدل گیا تھا۔ شاہمالی خواب دیکھتے دیکھتے ان کی بھول بھلیوں میں اتنا کھو گئی تھی کہ اُسے قبر کی تہوں میں اتارنا پڑا تھا تا کہ وہ ہمیشہ سوتی رہے۔ اور خواب دیکھتی رہے، اور اسے جگانے والا کوئی پاس نہ ہو۔

شاہمالی کے مرنے کے بعد خدیجی کو یہ کٹھار کتنا سونا سونا سا لگتا تھا۔ وہ پہروں دروازے پہ بیٹھ کر دور پرے میدان کے آس پاس لوگوں کو گھوڑوں پہ بیٹھے چلتے دیکھا کرتی —— ان عورتوں کو دیکھتا جو مردوں جیسا پوشاک پہنے برف پہ پہلن کا کھیل کھیلا کرتی تھیں —— ان بچوں کو دیکھتی جو چھوٹے چھوٹے دستانے پہن کر اور ننھی منھی جرابیں پہن کر برف کے گولے بنا کر تالیاں بجاتے تھے —— وہ دیر تک ان چیزوں کو دیکھتے دیکھتے ان میں کھو جاتی —— حتیٰ کہ اندھیرا اترآتا۔ اور بچے اپنی آیاؤں کے ساتھ چلے جاتے۔ عورتیں اپنے مردوں کے کندھوں سے لگی چلی جاتیں —— اور ٹٹو والے، اپنے ٹٹو سنبھالے چپ چاپ اپنے کٹھاروں کو لوٹ آتے —— ان لوٹنے والوں میں اُس کا مرد بھی ہوتا، اپنے ٹٹو کی راس پکڑے ہوئے اندر جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوتا۔ تو وہ بچوں کے سے انداز میں مچل مچل کے پوچھتی —— آج تمہارے ٹٹو پر کون بیٹھا تھا، مالک —— ؟ وہ عورت تو نہیں جو مردوں جیسا پوشاک پہنے تھی —— ؟ وہ مرد تو نہیں، جو ٹٹو پہ بیٹھ کر تھر تھر کانپنے لگتا تھا —— ! وہ بچہ تو نہیں جس کے گال ٹماٹر کی طرح سرخ سرخ تھے —— ؟

اور ممدو ـــ دن بھر کا تھکا ہارا ممدو ـــ اپنے پکھٹے ہوئے پیروں کی طرف دیکھ کر جواب دیتا ـــ خدیجی ، آج مکی کی روٹی پکی ہے یا جو کی ـــ ؟ ـــ اور خدیجی کے ذہن میں بسی ہوئی تمام تصویروں کے رنگ خلط ملط ہو جاتے ـــ اور پھر ایک ہی تصویر باقی رہ جاتی ـــ مٹیالی سی دھبے دار تصویر ـــ جس میں ایک مرلی ساٹھ ہوتا ـــ ایک جو کی روٹی ہوتی ، ایک غار سا کھنڈر ہوتا ـــ اور ایک بھیانک ، لمبی ، اندھیری رات ـــ

چاندنی اُس کونے سے اس کونے تک بچھ گئی تھی ـــ ممدو ٹٹو کے ساتھ دوڑتے دوڑتے بے دم سا ہونے لگا تھا۔ دوڑتے دوڑتے خدیجی کے الفاظ رہ رہ کے اُس کے کانوں میں گونج اٹھتے "ممدو ! آج جلدی آ جانا ـــ نہ جانے مجھے آج ڈر کیوں لگ رہا ہے ـــ"

ممدو جانتا تھا کہ خدیجی نے یہ کیوں کہا ہے ۔ اِن دنوں اُسے خدیجی کا دبا دبا چھپا چھپا انداز اور شرمیلے تیور بہت اچھے لگتے تھے ـــ ہائے کس انداز سے شرما کر بھاگ جاتی تھی ۔ جیسے کسی نے پیار کرتے پکڑ لیا ہو ـــ آج وہ کبھی گھر سے باہر نہیں آتا ، اگر اس نے صاحب سے دو روپے پیشگی نہ لئے ہوتے ـــ پھر وہ لفظ کرکے کیسے انکار کر دیتا ـــ اِن

لوگوں کا مذہب، قانون، اور اقرار نامہ تو اسی لفظ پر قائم ہوتا ہے کیسے انکار کرتا آخر —؟

آتی بار اُس نے سوچا تھا کہ یہ دو گھنٹے یوں چٹکی بجاتے گزر جائیں گے — اور وہ خواجہ جی کے پاس پہنچ جائے گا — اور کسی تجربہ کار عورت کو لے آئے گا — اور پھر ہر چیز آسان ہو جائے گی —

دوڑتے دوڑتے اُسے کئی بار خیال آیا کہ وہ صاحب سے کہے کہ دو گھنٹے اُس کے اندازے کے مطابق کب کے ختم ہو گئے ہیں — مگر اس خیال سے کہ کہیں صاحب ناراض نہ ہو جائے اور ان دو روپوں سے ہاتھ دھونا پڑیں وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

نہ جانے دو روپیوں کا خیال آتے ہی ہونٹوں پہ مہر کیوں لگ جاتی ہے — لوگ کہتے ہیں کہ پیسہ ہاتھ کی میل ہوا کرتا ہے — مگر گلمرگ کی ہری بھری ڈھلانوں میں میل کا کیا کام —؟ یہاں تازہ ہوا ہوتی ہے، سر سبز گھاس ہوتی ہے — چیل اور صنوبر ہوتے ہیں — افق اور شفق ہوتے ہیں، چاندنی کے جزیرے ہوتے ہیں — یہاں میل کا کیا کام —؟

ملک نے تصور کے ہاتھوں سے اپنی جیبیں ٹٹولیں مگر ان دو روپوں کے سوا وہاں کچھ بھی نہ تھا — اور پھر اُسے اچانک خیال آیا کہ اُس نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کھایا — چاول ختم ہو گئے تھے اور دکاندار نے ادھار دینے سے انکار کیا تھا — کون سیزن ختم ہوتے ہوتے کسی

کو ادھار دے اور وہ بھی گلمرگ میں ۔۔۔! اُسے خیال آیا کہ ٹٹو کا چارہ بھی ختم ہو گیا ہے ۔۔۔ یہ سب چیزیں تو تب ہی آتی ہیں جب دن بھر کچھ کما لیا جائے ۔

"صاحب !" ممدو نے آخرکار اپنے لب کھول دیئے ۔

"کیا ہے ۔۔۔؟" صاحب نے گھوڑے پر ہی بیٹھے بیٹھے جواب دیا ۔

"کیا ہے ۔۔۔؟!" آس پاس کی پہاڑیوں نے یک زبان پوچھا ۔۔۔

"صاحب ! وقت کیا آیا ہوگا ۔۔۔" ممدو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

"دس بج گئے ہیں ۔۔۔" صاحب نے بے خیالی میں جواب دیا ۔

"صاحب ! پھر تو دو گھنٹے سے زیادہ ہو گیا ۔۔۔ آپ تو پورے آٹھ بجے ہی گھوڑے پر بیٹھے تھے ۔۔۔"

"ابھی کہاں ہو گئے دو گھنٹے پورے کہیں کے ۔۔۔" صاحب کو غصہ آ گیا ۔

"صاحب ! میری گھر والی بیمار ہے ۔" ممدو نے بے چارگی سے کہا

"بیمار ہے تو میں کیا کروں ۔۔۔؟" پہاڑیوں میں گونج پیدا ہو گئی ۔

"صاحب اُسے سخت تکلیف ہو گئی ہے ۔۔۔ مرنے کا خطرہ ہے"

"مرنے والوں کو کون روک سکتا ہے بے ؟"

"کون روک سکتا ہے بے !!" پہاڑیوں نے للکارا

"اچھا صاحب! میرا نہیں تو کم از کم گھوڑے کا ہی خیال کیجئے ——— مر جائے گا بے چارہ ———"

پیسے نہیں لئے ہیں تم نے ———؟ گھوڑا مر جائے تو میں اُس کے لئے ذمہ دار ہوں ———؟؟ ———"

ممدو ایک پتھر پر سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ ——— اور زندگی میں پہلی بار ——— یا شاید دوسری بار یا تیسری بار یا دسویں بار۔ اُس کی آنکھوں میں بے بسی لپس گئی! اور دھندلا گئیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے کوئی دھیرے سے کراہ اٹھا ہو اور ساتھ ہی اُس کے کانوں میں گونج پیدا ہو گئی ———

"مرنے والوں کو کون روکتا ہے بے!!"

پھر سوچے سمجھے وہ چلایا ——— "صاحب! صاحب!! اپنے دو روپے واپس لیجئے۔ میں نے گھوڑا دو گھنٹوں کے لئے دیا تھا ساری رات کے لئے تو نہیں دیا تھا ——— واپس لیجئے یہ دو روپے ———"

دوسرے لمحے ممدو کے چہرے پر چابک لہرایا۔ اور ایک لکیر سی کھنچ گئی۔ کان کی لو سے لے کر ہونٹ کے کونے تک ——— چابک دوسری مرتبہ لہرایا اور خون کی پتلی سی دھار بہہ گئی ———

"جاہل ——— کمینے!"

"جاہل ——— کمینے!!" پہاڑیاں چیخ اٹھیں

"سارا موڈ خراب کر دیا ——— لاؤ روپے اور دفعان ہو جا ——— کل صبح ہوتے ہی میں تمہاری شکایت کر دوں گا ——— اُلّو کے بچے ———"

"ہاتھ کے نیچے ــــ" خون کی پتلی سی لکیر بول پڑی

"جاہل ــــ کمینے! ــــ" جنت کے سیاح نے آواز دی

ممدو نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ٹٹو کی طرف دیکھا، جو نتھنے پھلائے ہانپ رہا تھا اور اپنے مالک کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

دیا جلا کر خدیجی چرخے کے سامنے بیٹھ گئی ــــ اس چرخے پر کبھی شاہمالی بیٹھا کرتی تھی۔ اور خواب دیکھتی تھی۔ اور گنگنایا کرتی تھی ــــ آجکل خدیجی بیٹھا کرتی تھی ــــ اور ایسے خواب دیکھا کرتی تھی کہ جن کی تعبیریں نہ جانے کہاں کھو گئی تھیں اور ایسے گیت گاتی تھی جن کے بول نہ جانے کس جنت کی کہانیاں سناتے تھے۔

چرخے کے پاس بیٹھ کر خدیجی کا درد اور بڑھ گیا۔ اُس نے انہیں یاد کر کے اس درد کو فراموش کرنے کی بہت کوشش کی پر نہ جانے یہ کیسا درد تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا ــــ آج وہ اپنے گھر کے دروازے پر بیٹھی دور پولو میدان کے آس پاس ٹہلنے والوں کو نہ دیکھ سکی تھی۔ آج وہ ان ننھے منھوں کی طرف بھی نہ دیکھ سکی تھی جو ہمیشہ اُس کے ذہن کے دریچوں میں موجود رہتے تھے۔

آج ــــ آج نہ جانے کیوں ان دریچوں کے پٹ کھل گئے تھے۔

آج نہ جانے کیوں ان دریچوں میں کلیلیں بس گئی تھیں ——— کل سے ایسا ہی تھا۔ پرسوں سے ایسا ہی تھا ——— آخر یہ خوشی آمدہ چہل کیوں سما گئی تھی ہواؤں میں ———؟ کون آ رہا تھا آخر ———؟

اللہ! یہ کیسا مہمان ہے جو آنے سے پہلے اتنی ساری چیزیں بھیجتا ہے ———؟ خدیجی اس خیال سے شرما گئی ———

اور یکایک وہ درد کی شدت سے تڑپ گئی جیسے ابابیل بجلی چمکنے پر تڑپ جاتی ہے۔ ——— اور پھر اس کے ذہن میں بسی ہوئی بہت پرانی تصویروں کے رنگ خلط ملط ہو گئے۔

ممدو! آج تمہارے ٹٹو پر کون بیٹھا تھا ———؟ وہ بچہ تو نہیں جس کے گال ٹماٹر کی طرح سرخ اور پھولے پھولے ہیں ———؟

کیا سب ہی بچے ایسے ہی ہوتے ہیں ———؟ کہاں ہوتے ہیں ایسے بچے؟ نوری کا بچہ تو بس سوکھا سوکھا مریل سا لگتا ہے ——— جیسے آنتیں باہر نکل آئی ہوں ——— کیا میرا بچہ بھی ———؟

خدیجی ایک بار پھر درد سے کراہ اٹھی۔ ماں نا: یہ ممدو کیوں نہیں آ رہا ہے کتنی دیر لگا دی آنے میں ——— تاکید تو کی تھی میں نے جلدی آنے کی ——— اور ممدو کے بارے میں سوچتے سوچتے خدیجی کو خواہ مخواہ اس پر پیار آ گیا ——— ابھی تھکا ہارا آئے گا، اور کھانا مانگے گا ——— پر میں کیا کروں؟ یہ موا درد تو میری رگ رگ سے جان نکال رہا ہے ——— اے اللہ! میں مر گئی ———!!!

جانتی ہو خدیجی ــــ؟ پر تمہیں کہاں معلوم ہوگا ــــ میرے ننھو! جس دن ممدو پیدا ہوا تھا، اُس دن بہت طوفان آرہا تھا ــــ اور ممدو کا باپ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا ٹٹو کے ساتھ ــــ اگلے شہر تک چلا گیا ہو، یا شاید کھلن مرگ تک ہی ــــ مجھے درد شروع ہو گیا ــــ اکیلی تھی اس کٹیا میں ــــ کوئی بھی آس پاس نہیں تھا ــــ پھر ــــ مجھے سخت درد تھا، میں نے مارے درد کے اپنا ہاتھ کاٹ کھایا ــــ یہ زخم کا نشان دیکھتی ہو نا، یہ وہی نشان ہے۔ پھر میں بے ہوش ہو گئی۔ نہ جانے کتنی دیر کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں ــــ تو ممدو کا ابا میرے سرہانے بیٹھا رو رہا تھا۔ اور خدیجی کیا بتاؤں ــــ؟ گل گوتھنا سا ممدو میری چھاتی سے لگا چپڑ چپڑ دودھ پی رہا تھا۔

ارے! یہ شاہمالی کہاں سے بول رہی ہے؟ کیا قریب سے آرہی؟ واپس آتے ہیں ــــ؟ اُف! ارے!! یہ کیا ہو رہا ہے ــــ مجھے ــــ؟ درد تھوڑا کم ہو جائے تو میں ــــ ممدو نے صبح بھی کچھ نہیں کھایا ہے دن بھر ٹٹو کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے جان ہی تو نکل جاتی ہے۔

مگر یہ زلزلہ ــــ!

یہ کوٹھا کیوں گھوم رہا ہے ــــ؟ یہ دیواریں کیوں ہل رہی ہیں ــــ؟ ارے! یہ چراغ کس نے گل کر دیا ہے ــــ؟ یہ اندھیرا کیوں بڑھ رہا ہے۔ ممدو! ممدو!! مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔

ــــ مجھے نیند آرہی ہے ــــ تم کہاں ہو ممدو؟

ب مجھے نیند آرہی ہے ——

دُھندلا کوئی منحوس کُتا بھونک رہا تھا ——

ممدو نے ٹٹو کھٹار کے دروازے پر باندھ دیا اور اندر چلا گیا۔ اندر اندھیرا گھُور رہا تھا ——

"خدیجی —— !" اُس نے ہلکے سے آواز دی —— کوئی نہیں بولا

"خدیجی —— !" ممدو نے قدرے زور سے پکارا ——

"دیا کیوں نہیں جلایا ہے ری —— ؟"

اچانک کسی نوزائیدہ بچے کی پہلی چیخ —— یا دوسری یا تیسری چیخ فضا میں اُبھر آئی —— ممدو کا دل بیٹھ گیا۔ اور پھر زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"خدیجی : تم کہاں ہو —— ؟ یہ —— یہ کون چیخا ہے —— ؟" اُس نے تھرتھرائی آواز میں پوچھا، اور اندھیرے میں اُسے ٹھوکر لگی اور وہ گر گیا —— گرتے پڑتے اُس نے دیا سلائی کی ڈبیہ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ممدو کے ہاتھ کسی نرم گرم چیز سے مَس ہوئے۔ اندھیرے میں اس نرم گرم چیز نے حرکت کی اور ساتھ ہی دوسری چیخ فضاؤں میں پرواز کر گئی —— اُس کے بعد نرم گرم چیز نے باقاعدہ

رونا شروع کیا۔

"خدیجی! تم بولتی کیوں نہیں آخر یہ سب کیسے ہو گیا ــــ؟ کب ہو گیا؟"

حمدو اپنی آواز پر چونک پڑا ــــ یہ میری آواز نہیں ہو سکتی ــــ میری آواز کو کیا ہو گیا ہے ــــ؟ جیسے کسی نے زبان پر انگارہ رکھ دیا ــــ اسی وقت حمدو کے ہاتھ دیا سلائی کی ڈبیہ سے ٹکرا گئے

"سرر" ایک تیلی جل کے بجھ گئی ــــ اُس نے جلدی میں دوسری تیلی جلائی ــــ وہ بجھ گئی ــــ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ــــ اُس نے ایک اور تیلی جلا کر دیا روشن کیا۔ ــــ اور ساتھ ہی اُس کی چیخ نکل گئی ــــ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا ــــ

"خدیجی! میں کسی کو لے آؤں گا ــــ نہ ــــ وہ غلامے کی ماں ــــ ہاں وہ ٹھیک رہے گی ــــ اُسے ان باتوں کا تجربہ ہے ــــ" حمدو نے چہرہ ڈھانپے ہوئے پوچھا ــــ پھر وہی اجنبی آواز یہ میری آواز تو نہیں ہے ــــ یہ میری آواز کو کیا ہو گیا ہے ــــ

خدیجی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حمدو نے ایک ہاتھ سے اُسکے کندھے کو دھیرے سے ہلایا ــــ اور ساتھ ہی اُس نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ خدیجی برف کی مانند سرد تھی ــــ سرد اور بے حس ــــ

دور، منحوس کتا بدستور بھونک رہا تھا۔ گلمرگ کی ڈھلانوں میں چاندنی رقص کی منزلوں میں تھی۔ اور ململ کے مہین ڈوپٹے خموشیوں میں بدستور سرسرا رہے تھے۔

نیڈورز کے بار روم میں ہیجان ہو گیا۔ کانچ کا جام منہ سے لگاتے ہوئے شری مراری لال ہلدی والا نے اپنی کرسی آتشدان کے قریب کھینچ لی ـــــ اور اپنے آپ سے بڑبڑانے لگا۔

یہ گلمرگ ـــ! ہپپا! کتنی پیاری جنت ہے۔ یہاں عمدہ شراب ملتی ہے ـــــ ہپپا!! اس پر بھی یہاں کے لوگ خوش نہیں ـــــ جاہلوں کی اولاد ـــــ ہپپا!! شراب، محبت، حسن ـــــ میری کتابوں میں کیا کچھ نہیں ہوگا۔ ـــــ ہپپا!! ـــــ "

"بیرا ـــــ!"

اور چند لمحوں کے بعد جب بیرا آ گیا تو نیڈورز سے کچھ ہی دور رحمان کے کمرے میں میلے سے طاق پر رکھا ہوا دیا ہوا کے ایک ہی جھونکے سے بجھ گیا۔ اور رحمان نے سوچا اب یہ دیا کبھی روشن نہیں ہوگا۔ اس طاق کے نیچے چرخے کے پاس اب کوئی گیت نہیں گنگنایا جائے گا۔ اب کسی تصویر سے

رنگ خلط ملط نہیں ہوں گے۔ اب کوئی بچہ اپنی آیا کی گود میں نہیں ہمکے گا ـــــ
کیونکہ خدیجہ جنت کی فضاؤں کو ٹھکرا کر چلی گئی ہے ـــــ

اُس نے اپنے پہلے ـــــ اور آخری بچے کو گود میں اٹھا لیا ـــــ
کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس کی ناف کو کپڑے کے ایک ٹکڑے سے
باندھ دیا۔ ـــــ اور پھر اُسے گود میں لے کر، چپکے چپکے ہولے ہولے رونے
لگا۔

نازلی

نازلی سے مجھے ایک خوبصورت قسم کی میٹھی میٹھی سی شکایت ہے اور جس دن یہ شکایت نہ رہے گی۔ آپ اس کہانی کو بھول چکے ہوں گے

اس شکایت کی کہانی اس زمانے سے شروع ہوتی ہے جب میں ایلی گنس میں سیلزمین تھا!

ایلی گنس کی مشہور فرم میں الگ الگ کاؤنٹر تھے اور ہر کاؤنٹر پر ایک ایک سیلزمین ہوا کرتا تھا۔ جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ اور یہ شاید مسٹر ایلی کے دماغ کی اختراع تھی۔ کہ جس کاؤنٹر پر مردوں کے کام کی چیزیں رکھی تھیں۔ اس پر لڑکیاں کام کرتی تھیں۔ اور جس کاؤنٹر پر عورتوں کے کام کی چیزیں تھیں۔ اس پر مرد کام کرتے تھے! یہی وجہ ہے کہ میں عورتوں کے سامانِ آرائش کے کاؤنٹر پر تھا۔ جسے میں جمالیاتی کاؤنٹر کہا کرتا تھا۔ اور میرے بازو والے کاؤنٹر پر جہاں مردوں کے استعمال کی چیزیں فروخت ہوا کرتی تھیں

میری ہم کار نازلی کی حکومت تھی۔ نازلی کے کاؤنٹر پر "ٹائی پن" سے لے کر "قلمی تسبیح" تک مردوں کے استعمال کی ہر چیز تھی! اور میرے کاؤنٹر پر "آئی برو پنسل" سے لے کر "سپر ٹان" تک عورتوں کے کام کی ہر چیز تھی۔ میرے کاؤنٹر پر عموماً کالج کی لڑکیاں اور سوسائٹی گرلز آتی رہتی تھیں۔ اور نازلی کے کاؤنٹر پر کالج کے لڑکے، پی ڈبلیو ڈی کے کلرک، ہشتی رنبیر اور ہوٹلوں میں راک ان رول چلنے والے چھوکرے کھڑے نظر آتے۔ ان دنوں ایلی گنس میں بڑا رش رہتا تھا کیونکہ وہاں قریب قریب تمام چیزیں میڈ ان انگلینڈ ملتی تھیں جنہیں ہندوستانی عورتیں اور مرد زیادہ پسند فرماتے ہیں۔ فرصت کے وقت اور خاص کر جس وقت مسز شنیلے کا بھاری بھرکم وجود دکان میں نہ ہوتا تھا میں اور نازلی اس مسئلہ پر دیر تک باتیں کرتے کہ ہندوستانی عورتیں اور مرد خاص کر انگلستانی چیزیں کیوں پسند کرتے ہیں لیکن اس بات پر میں اور نازلی کبھی متفق نہیں ہوئے جیسے اس بات کو فی الحال جانے دیجیے۔ ویسے نازلی اور میں کسی حد تک دوست ضرور تھے۔ یہ دوستی صبح نو بجے سے لے کر شام کے نو بجے تک قائم رہتی اور اس کے بعد دوسرے دن صبح نو بجے تک کے لیے ختم ہو جاتی تھی۔ یہ عجیب ماڈرن قسم کی آفیشل دوستی تھی۔ صبح سویرے گڈ مارننگ سے شروع ہو کر شام کو گڈ نائٹ پر ختم ہو جاتی تھی۔ اور اس سو فیصدی میڈ ان انگلینڈ دوستی پر میں اندر ہی اندر کڑھتا، بل کھاتا، بھنوؤں کو سکیڑتا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ خدا کا شکر بجا لاتا کہ نازلی جیسی خوبصورت لڑکی سے کم از کم دوستی تو

ہے

اس دوستی کا ایک لطیف پہلو یہ بھی تھا کہ ہم دونوں غیر شادی شدہ تھے
اور شادی کے بارے میں ہم دونوں کے خیالات اور ارادے جدا جدا تھے۔ نازلی
کسی ایسے آدمی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی جو بہت مالدار ہو۔ ذرا بھی خوبصورت
نہ ہو بلکہ تھوڑا سا بدصورت بھی ہو۔ اور میں کسی ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جو
بے حد خوبصورت ہو، پڑھی لکھی ہو اور انگریزی شاعری کی دلدادہ۔

نازلی کے ان خیالات کے پس منظر میں صرف یہ بات تھی کہ وہ انتہائی
غریبی کے دن دیکھ چکی تھی۔ اور اُس نے ایلی گنس میں نوکری کرنے سے پہلے
خالی پیٹ سونے کا بھی مزہ چکھا تھا۔ اُس کا کہنا ہے کہ نوکری سے پہلے اُسے اپنی
گلی کا ایک آوارہ مزاج شرابی دادا دل ہی دل میں اپنی منکوحہ بنانے کا قصد کر چکا تھا۔
ویسے میں نے بھی بہت کچھ نشیب و فراز دیکھے تھے۔ اور کئی مرتبہ سوچتے سوچتے
رہ گیا تھا کہ خودکشی کرنا گناہ کیوں قرار دیا گیا ہے جب کہ یہ کبھی کبھی ایک نعمت سے
کم نہیں!

مجھے ایلی گنس میں ایک پادری کی وساطت سے نوکری مل گئی تھی جو خدا ترس
آدمی تھا اور جس کی بات مسٹر ٹنڈلے شاید ہی کبھی ٹالا کرتی تھی۔ اور نازلی محض اپنی خوب
صورتی کے سرٹیفکیٹ پر رکھ لی گئی تھی۔ ویسے نازلی تھی بہت طرحدار۔ بقول ایک گشتی
رومیو کے جو ہر سنیچر کو نازلی کے کاؤنٹر پر موجود ہوتا تھا۔ نازلی کا جسمانی جغرافیہ
ونڈرفل تھا۔ کاؤنٹر پر کھڑی ہوتی تو کسی قلوپطرہ کا گمان ہوتا تھا۔ بات کرتے کرتے
گردن ذرا ایک طرف جھکا دیتی تو ہیلن کے متعلق کہی ہوئی وہ نظم یاد آجاتی . . .

. . . . . WAS THIS THE FACE

لیکن میں یہ نظم بھی نہ گنگنا سکتا تھا۔ کیوں کہ میں مجبور تھا۔ اور نازلی بھی مجبور تھی۔ اس لئے ہم صرف آفیشل دوستی پر قانع و شاکر تھے۔ میں اپنی ہلین کا انتظار کر رہا تھا اور نازلی اپنے ہنری فورڈ کا انتظار کر رہی تھی۔ اور اس باہمی مفاہمت نے ہمیں بہت زیادہ پریشان ہونے سے بچا لیا تھا۔

میں اپنے کاؤنٹر پر کسی نئے معطر کی شیشی دیکھتے ہوئے سوچتا رہتا تھا۔ کہ اگر نازلی میری ہوتی۔ تو میں اپنی نصف تنخواہ صرف کر کے اُس کے لئے عطر کی یہ شیشی لے آتا۔ تاکہ اس کی خوشبو سے وہ مدہوش ہو جائے۔

ایک دن میں نے نازلی کو ایک خوبصورت ٹائی سے بے خیالی میں کھیلتے ہوئے دیکھا۔ اور جب اُسے محسوس ہوا کہ میں اُس کی یہ حرکت دیکھ رہا ہوں تو اُس کے گالوں کے سیب گلنار ہو اٹھے۔ آنہ! وہ بھی نہ جانے کن خوابوں کا گلا گھونٹ رہی تھی محض اپنے ان دیکھے، انجانے ہنری فورڈ کی خاطر۔ اور میں بھی نہ جانے کن سپنوں کے تانے بانے میں اُلجھا ہوا تھا۔ فقط اپنی مجبوری کے پیش نظر ہائے! یہ زندگی کتنی پیچیدہ ہے اور انسان کتنا سادہ لوح!

ایک دن میں نے سادہ لوحی میں نازلی سے پوچھا۔

"نازلی! اگر شادی کے بارے میں یہ خیالات نہ ہوتے جو ہیں تو تم اپنے لئے کیسا جیون ساتھی پسند کرتیں؟"

اور نازلی نے معصومیت سے جواب دیا۔

"میری پسند وہی ہوتی جو میرے ماں باپ کی پسند ہوتی۔"

اور میں یہ سن کر حیران رہ گیا تھا کہ اس مغربی فرم میں یہ مشرقی ذہن کیا

"سنی ــــــ ؟"

زندگی ایسے چوری چھپے گزر رہی تھی۔ کہ نازلی پر ایک مصیبت نازل ہو گئی۔ اس دن لنچ کے وقت میں دکان سے باہر جانے لگا تھا۔ کہ نازلی کا چہرہ دیکھ کر رُک گیا۔ اس چہرے میں آج تفکرات کے سلسلے فروزاں تھے۔

"کیا بات ہے ڈیر ؟"

میں نے پوچھ لیا۔

اور میرا یہ جملہ سن کر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے بغیر کوئی جواب دیئے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ خط اس کے باپ کا تھا جس میں لکھا تھا کہ ان لوگوں نے نازلی کے لئے ایک رشتہ منظور کر لیا ہے۔ لڑکا خوبصورت ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ اور نوکری بھی کر رہا ہے۔ یہ بھی لکھا تھا کہ اگر نازلی چاہے تو اُسے دکھلانے کو لڑکے کا فوٹو منگوایا جا سکتا ہے۔

میں نے خط پڑھ کر لفافہ نازلی کو واپس کر دیا۔ جی میں تو آئی کہ کہہ دوں کہ بہت کچھ کہہ دوں، مگر میں کچھ نہ کہہ سکا۔ کبھی کبھی خود اپنی آواز سے ڈر لگتا ہے۔ میں اس وقت بھی ڈر گیا۔ اس لئے کچھ نہ کہہ سکا۔ اور دوسرے لمحے میں دکان سے باہر چلا آیا۔

باہر آ کر مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل کے چراغ کو ہتھیلی پر رکھ کر ایک ہی پھونک سے بجھا دیا ہو۔ اور پھر میرے آگے پیچھے کی دنیا اندھیری ہو گئی۔

میں جانتا تھا کہ نازلی کے باپ کے پاس دولت نام کی کوئی چیز نہیں

ہے۔ نہ جانے اُس نے بیٹی کی شادی کا بندوبست کیونکر کیا ہے۔ مگر اس کا کیا؟ ہوہی جایا کرتا ہے بیٹی کی شادی کا بندوبست۔ کبھی مکان بیچ کر اور کبھی ایمان بیچ کر۔ غریب آدمی کے پاس ان دو چیزوں میں سے ایک چیز ضرور ہوتی ہے لیکن میں نے نازلی سے یہ بات نہ پوچھی۔ ہمت ہی نہ ہوئی پوچھنے کی۔

نازلی دن بھر تھکی تھکی سی اپنے کام میں مصروف رہی۔ میں بھی سہما سہما سا اور پریشان رہا۔ شام کو جب ہم جانے لگے تو قاعدے کے مطابق ہماری دوستی ختم ہو گئی تھی۔ لیکن پھر بھی ہم ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

"اب تم نے کیا سوچا ہے نازلی؟"

میں نے پوچھ ہی لیا

"سوچنا کیا ہے، جو ہو گیا سو ہو گیا:" نازلی نے اطمینان سے جواب دیا۔ میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی!"

"مگر تمہارے خیالات؟ میرا مطلب ہے شادی کے بارے میں جو تمہارے ارادے تھے اُن کا کیا ہوا؟"

"ارادے بدلنے پڑتے ہیں۔ کبھی کبھی۔"

"پھر تم کیوں نہیں بدلیں؟ تمہارے چہرے پر یہ فکرمندیاں کیسی ہیں؟ تمہارے سراپا میں یہ اداسی کیسی ہے؟ تمہاری آنکھوں کا یہ انتظار کیوں نہیں گیا؟"

میں نہیں کہنا چاہتا تھا یہ باتیں۔ لیکن کہہ ہی گیا۔ جذبات کی ہلچل۔ نازلی چلتے چلتے رُک سی گئی۔ اُس نے مجھے عجیب سی نگاہوں سے گھورا۔

"یہ تمہارا وہم ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو؟ میں بے وقوفوں کی طرح دریا میں کود

کر جان دے دیتی، پہاڑ سے ٹکرا کر مر جاتی؟ میں نے پانچ برس اپنے ہنری فورڈ کا انتظار کیا — اب اور کتنا انتظار کروں، کیا عمر بھر — ؟

"— مگر نازلی یہ سراسر زیادتی ہے۔ تمہارے ماں باپ کو تم سے پوچھ تو لینا چاہیئے تھا۔"

نازلی کی آواز کی شدت ذرا کم ہو گئی۔ چند لمحوں تک وہ بالکل خاموش رہی پھر اُس نے دھیرے سے کہا۔

کیا تم اُن سے یہ بات EXPECT کرتے ہو؟ وہ لوگ پرانی روایتوں کے قائل ہیں۔ بھلا ان معاملوں میں کبھی لڑکی سے بھی پوچھا جاتا ہے؟" اُف نازلی ان چند ہی گھنٹوں میں کتنی بدل گئی تھی — "اتم تصویر بھی تو دیکھ سکتی ہو!"

"میں لڑکی ہوں آفتاب صاحب! میں نے گھر لکھ دیا ہے کہ انہوں نے یہ جملہ لکھ کر میرا دل دکھایا ہے۔"

یہ تو کوئی دوسری لڑکی تھی جو ایسے بول رہی تھی۔ نازلی کا یہ رُخ تو آج تک مجھ سے پوشیدہ تھا۔ میں دم بخود رہ گیا۔

"تم اپنے آپ کو تباہ کرو گی نازلی!"

"انسان صرف اپنے آپ ہی کے لئے نہیں جیتا ہے۔ دوسروں کے لئے بھی زندہ رہتا ہے۔ اور پھر میرے ماں باپ اب بوڑھے ہو چکے ہیں وہ مجھ سے کوئی غیر معمولی حرکت برداشت نہیں کر سکیں گے۔"

نازلی نے اطمینان سے جواب دیا۔

اس کے بعد میں نے اور کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن دل میں طوفان

بدستور اٹھتے رہے۔ اس واقعے کے بعد میں شاید الیگنس کو نہیں یا نہ کہتا لیکن نازلی کے اور میرے درمیان جو باہمی مفاہمت کار فرما تھی۔ اس نے ساری بات کو قابلِ برداشت بنا لیا۔ دراصل اپنے اپنے تحت الشعور میں ہم دونوں نے ناگزیر کو جگہ دی تھی۔ اس لئے نازلی کی اور میری دوستی برابر قائم رہی۔ وہی بارہ گھنٹوں کی آفیشل دوستی۔

اس واقعہ کے بعد نازلی میں یکسر تبدیلی آگئی۔ وہ اب اپنے کاؤنٹر کے پاس کسی دولت مند بڈھے کو دیکھ کر سراپا پیار بن جانے کی بجائے اپنے چہرے پر سنجیدگی کا خول چڑھاتے سو فیصدی سیلز گرل بن جاتی تھی۔ خود مجھ میں بھی ایک بڑی تبدیلی سرگرم عمل تھی۔ میں اب حد سے زیادہ کم گو بننے لگا تھا۔

نازلی کی شادی میں دس بارہ دن رہ گئے تھے۔ ایک دن مجھے گھر سے تار ملا۔ لکھا تھا، ماں سخت بیمار ہے۔ آخری بار دیکھنے کے لئے فوراً چلے آؤ۔ تار پڑھ کر میرے چہرے پر نہ جانے ایسی کون سی کیفیت پیدا ہوگئی کہ جسے دیکھ کر نازلی دوڑی دوڑی آئی۔ اور تار میرے ہاتھوں سے چھین لیا۔

"اوہ ـــــ" اس نے صرف اتنا کہا۔ اس ایک اشارے میں وہ بہت کچھ کہہ گئی۔ تار لے کر وہ مسز اسٹینلے کے پاس گئی اور میری رخصت منظور کرا کے میرے ساتھ اسٹیشن تک چلی آئی۔ میں تمام راستے میں خاموش تھا۔ کیوں کہ میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ لیکن نازلی بولتی رہی۔ اسے دکھ ہو رہا تھا کہ میں اس کی شادی پر نہ آسکوں گا۔ اسے دکھ ہو رہا تھا۔ کہ میں نے آج تک اپنی ماں کی بات کو دو مرتبہ ٹالا تھا اور شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسے اس بات کا بھی دکھ ہو رہا تھا۔ کہ میں نے اپنی ماں کے اس ایک ارمان کو پورا نہیں کیا تھا۔

یہ نازلی نہیں بول رہی تھی۔ ایک عورت بول رہی تھی جس کے دل میں کئی طرح کا پیار ہوتا ہے۔ اور ہر طرح کے پیار کا ایک والہانہ انداز ہوتا ہے۔ یہ عورت کے خون میں بسی ہوئی وہ ممتا بول رہی تھی جسے ہر مرد پیدائش سے لے کر موت تک اپنے بہت قریب محسوس کرتا رہتا ہے۔ مختلف حالات میں، مختلف رنگوں میں مختلف انداز میں۔

میں نے اس طاقت کی شدت کو محسوس کیا مگر خاموش رہا۔ میں نازلی کو بیک وقت بہت قریب اور بہت دور محسوس کر رہا تھا جب گاڑی چلنے لگی۔ تو نازلی ایک ننھا سا سفید رومال نکال کر ہلانے لگی۔ رومال ہلاتے ہلاتے اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب مسکراہٹ ناچ اٹھی۔ اس مسکراہٹ نے مجھ سے کچھ کہا۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

جب میں گھر میں داخل ہوا تو میں سیدھا ماں کے کمرے میں چلا گیا۔ مگر ماں وہاں موجود نہ تھی۔ وہ رسوئی میں بیٹھ کر آٹا گوندھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اور میری حالت دیکھ کر وہ پہلے مسکرائی۔ اور پھر اس کی دونوں آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برسنے لگیں۔ جب بادل چھٹ گئے تو مجھے معلوم ہوا کہ میری ماں بیمار نہ تھی بلکہ یہ ایک ڈھونگ تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ میری شادی طے ہو گئی تھی۔ بلکہ طے کی گئی تھی۔ اور یہ سوچ کر کہ میں حسب معمول انکار نہ کر بیٹھوں مجھے دھوکے سے بلوایا گیا تھا۔

مجھے شدید غصہ آ گیا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے نازلی کی باتیں بھی یاد آ گئیں۔
"انسان صرف اپنے آپ ہی کے لئے نہیں جیتا ہے۔ دوسروں کے لئے

بھی زندہ رہتا ہے !"

کوئی نسوانی ہاتھ سفید رومال ہلا ہلا کر مجھے یاد دلا رہا تھا۔ اور میں منزل کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔ وہ بہن نہ جانے کب آئے۔ نہ جانے کب آئے میں شادی کے لیے رضامند ہو گیا۔

جس دن دلہن گھر میں آ گئی اس دن بہت چہل پہل تھی مجھے رہ رہ کر نازلی یاد آ رہی تھی۔ جانے اس کا دولہا کیسا ہو گا۔ میں نے دیکھا منی، میری چھوٹی بہن رو رو کر آسمان سر پر اٹھا رہی تھی۔ میں نے اسے گود میں لے کر پچکارا۔

"کیوں رو رہی ہو منی ؟"

"مجھے دلہن کا نام بتا دو !"

"میں کیسے بتاؤں ؟"

"پھر مجھے کون بتائے گا ؟"

"تمہیں کیا کرنا ہے نام جان کر ؟"

"واہ کرنا کیوں نہیں۔ میں وہ نام سلیٹ پر لکھ کر اسے دکھاؤں گی۔ کتنی خوش ہو جائے گی وہ۔ چوتھی جماعت میں پڑھتی ہوں جی !"

"تو جا کر اسی سے پوچھ لو۔ پھر سلیٹ پر لکھ کر مجھے دکھانا !"

منی تالیاں بجاتی ہوئی عورتوں کے جھرمٹ میں کھو گئی۔

میں باہر دالان میں کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔

نازلی کے بارے میں سوچنے لگا۔

"اس کی بھی شادی ہو گئی ہو گی !"

اتنے میں منی سلیٹ لے کر سامنے آگئی ـــــ سلیٹ پر ٹیڑھے میڑھے حروف میں لکھا تھا۔

"منی نیازی ـــــ الیاس نازلی آفتاب"

میں نے سلیٹ اُس کے ہاتھوں سے چھین لی۔ میں پاگل ہو گیا۔

نازلی نے یہ بات اب مجھے بہت دنوں کے بعد بتائی کہ اُس نے شادی سے پہلے ہی خط لکھ کر فوٹو منگوایا تھا ـــــ اور مجھے اُس سے یہ شکایت ہے کہ اُس نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا ـــــ؟

اُف! ـــــ یہ عورت ذات!!

●●

کل ۲ باب

[illegible]